نگار

جلد ۲۷	فہرست مضامین مارچ ۱۹۳۵ء	شمارہ ۳

ملاحظات — ۲

پارسی اہلِ کتاب ہیں — (مترجم) سید وجاہت حسین ایم۔ اے — ۹

محبت کی یادگار — اعظم کریوی — ۱۷

مصطفےٰ کمال کی زندگی کے چند دلچسپ اوراق — ۲۵

حقیقت — شبلی ابراہیمی ایم۔ اے — ۳۲

مسئلۂ خلافت و امامت — ہرنام — ۳۷

چند دلچسپ نتائج مطالعہ — ۶۰

باب المراسلۃ والمناظرہ — ۶۵

باب الاستفسار — ۷۰

مطبوعات موصولہ — ۷۳

رباعیات آسی — ۷۹

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمارہ ۳	مارچ ۱۹۵۳ء	جلد ۲۷

ملاحظات

انسانی زندگی کا معیار اور ہمارے علمارِ کرام

عہد حاضر میں علوم ریاضیہ کی ترقی نے ذہن انسانی میں عجیب قسم کی جستجو پیدا کردی ہے، وہ چاہتا ہے کہ ہر چیز کی ناپ تول کرسکے، اس کے عرض و طول، بلندی و عمق کا اندازہ کرسکے اور جب اس سے سوال ہو کہ فلاں امر کی حقیقت کیا ہے تو وہ بتا سکے کہ اس کے حدود یہ ہیں، اس کے ابعاد ثلثہ کی پیمایش یہ ہے اور اعداد و شمار کے لحاظ سے اس کو یوں بیان کرسکتے ہیں — پھر یہ ذوق انھیں چیزوں تک محدود نہیں، جو مادی ہیں، مرئی ہیں، جامد ہیں، بلکہ کیفیات و وجدانیات کی تحقیق بھی انھیں خطوط پر کی جاتی ہے اور بالکل ریل کی رفتار کی طرح خلاق انسانی اور تخیل دماغی کا بھی مقیاس متعین کیا جاتا ہے — لیکن سوال یہ ہے کہ حیات انسانی کا مقیاس کیا ہے اور عام طور پر جو نظریہ اسکی پیمایش کا قائم کیا جاتا ہے وہ کس حد تک صحیح ہے۔

ایک شخص کی زندگی پر جب گفتگو کی جاتی ہے تو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ اتنی مدت تک زندہ رہا، اتنے سال اور اتنے مہینے جیا، جوان مرگیا، بوڑھا ہوکر مرا، لیکن کیا یہ معیار درست ہے ـــ غالباً نہیں۔ کیونکہ یہ معیار انسان کی زندگی کا نہیں بلکہ اس کے جسم کی زندگی کا ہے۔

سکندر صرف ۳۳ سال تک اس دُنیا میں زندہ رہا، حالانکہ وہ ۳۰۰ سال قبل مسیح سے اس وقت تک زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہیگا۔ مسیح صرف ۳۳ سال زندہ رہے لیکن اپنی زندگی کے اخیر تین سال میں وہ اس طرح جئے کہ اپنے آپ کو خلعت دوام بخش گئے۔ اسی طرح دُنیا کے اور بڑے بڑے مفکرین اور تاریخ کے بڑے بڑے لوگوں کو لیجئے کہ وہ آج موجود نہیں ہیں، لیکن اُنکے آثار ہنوز باقی ہیں اور روزانہ ہزاروں لاکھوں زبان پر ان کا نام آجاتا ہے۔

ممکن ہے بعض کا خیال ہو کہ حیات انسانی کا معیار عیش ولذت، جاہ وثروت ہے، یعنی زندگی نام ہے لطف ونشاط کے ساتھ عمر بسر کردینے کا، جاہ وثروت کے حصول کا۔ لیکن محض ذاتی لذت اور زر ودولت کا انبار اپنے بعد کوئی تاثرات چھوڑ جانے والا نہیں اور اس لئے اجتماع بشری کی تاریخ ایسے لوگوں کی زندگی سے اعتنا نہیں کرتی ــــــــ اس لئے اگر صحیح معنی میں حیات انسانی کا کوئی معیار ومقیاس ہوسکتا ہے تو وہ مقیاس اجتماعی ہے یعنی یہ کہ ایک شخص نے قوم کی کیا خدمت انجام دی، ملک وملت کی اصلاح وفلاح کے لئے کیا کیا قربانیاں کیں اور دوسروں کو اپنے ذہنی یا مادی اکتسابات سے کیا فائدہ پہونچایا۔

دنیا کے جدید اجتماعی نظریئے زر ودولت کے مسئلہ کو صرف اسی حد تک اہمیت دیتے ہیں کہ وہ نوع انسانی کو فایدہ پہونچانے والے ہیں، دولت کا انبار بجائے خود بالکل مہمل چیز ہے اگر اس کی اعتباری قوتِ کاربرآری کو نظر انداز کردیا جائے اور یہیں سے اختلاف کی دو راہیں پیدا ہوتی ہیں جن میں سے ایک کا نام سرمایہ داری اور دوسری کا مطالبہ محنت وعمل ہے ـــ پھر جس رفتار کے ساتھ یہ احساس قوی ہوتا جارہا ہے، اس کو دیکھ کر یہ حکم لگانا دشوار نہیں کہ وہ وقت قریب ہے، جب ایک تاجر کی تجارت ایک سائنس داں کی ایجادات، ایک صناع کی صنعتگری سب کا مدعا صرف مفاد جمہور کے لحاظ سے متعین کیا جائیگا اور اکتساب زر یا فراہمی دولت کا کوئی سوال دنیا میں باقی نہ رہے گا۔ پھر آیئے اس سلسلہ میں غور کریں کہ مذہب اس امر میں کس حد تک نوع انسانی کا ساتھ دینے والا ہے؟

جس حد تک مقصود یا غایۃ کا تعلق ہے، ہمکو ماننا پڑے گا کہ مذہب کی تعلیمات یکسر مفاد جمہور پر مبنی ہیں اور تمدنی نقطۂ نظر سے وہ امن وسکون ہی کا خواہشمند ہے، لیکن تاریخ مذہب بالکل اس کے برعکس ہم کو یہ بتاتی ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ بدامنی وخونریزی مذہب ہی کی بدولت ہوئی اور فرشتوں کی یہ پیشین گوئی کہ انسان بجز "سفک دماء" (خون بہانے کے) اور کچھ نہیں کریگا حرف بہ حرف صحیح نکلی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ہمکو اصول مذہب کی جستجو تاریخ سے ہٹا کر صرف اس کی تعلیمات میں کرنی چاہئے اور اگر ایک بار یہ بات اصولاً متعین ہوجائے کہ دنیا کا امن وسکون یا نوع بشری کی فلاح صرف مذہب ہی کے ذریعہ سے ممکن ہے اور یہ کہ مذہب سے زیادہ اس کا کوئی حامی نہیں، تو پھر اس کا فیصلہ چنداں دشوار نہیں کہ مذہب اپنے عمل یا تعلیمات زندگی

کے لحاظ سے کسی ایک جگہ ٹھہر جانے والی چیز ہے یا ترقی تمدن کی سطح کے ساتھ اُبھرنے اور بلند ہو جانے والی۔

اس باب میں سب سے بڑی غلطی علمبرداران مذہب نے یہ کی ہے کہ انھوں نے عقیدہ، عمل اور مقصود کے باہمی ربط و تناسب کو بالکل پس پشت ڈال دیا اور بجائے اس کے کہ مقصود کی اہمیت کو سامنے رکھ کر عمل و عقیدہ کو اس کا تابع یا ذریعہ قرار دیتے، صرف عقیدہ کو اصل چیز سمجھ لیا اور مقصود کو اس کی تابعیت میں دیکر مذہب کی اہمیت کو نیست و نابود کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ اگر مذہب سے اس کے مجوزہ عقاید کو علٰحدہ کر دیں تو اس کا شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا اور وہ کوئی مرکز ایسا نہ پیدا کر سکے گا جس پر کسی جماعت کے افراد کا اجتماع ہو سکے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ "عقاید" ہی اصل چیز ہیں کس قدر کم فہمی کی بات ہے۔ مثلاً یوں سمجھئے کہ مذہب کے عقیدہ کا اصل الاصول ایک خدائے قادر مطلق کے وجود کو تسلیم کرنا ہے، لیکن صرف ذہن میں ایسا سمجھ لینا یا زبان سے اس کا اقرار کر لینا کوئی معنی نہیں رکھتا اگر اس عقیدہ کے ماتحت ہم اپنے اعمال و افعال میں کوئی تغیر نہ پیدا کریں اور یہ اعمال و افعال بھی بیکار ہیں اگر اُن سے ہمارے نظام تمدن یا ہماری اجتماعی زندگی کو کوئی فایدہ نہ پہونچے —— یہی حال صوم و صلوٰۃ کا ہے کہ محض قیام و قعود یا صبح سے شام تک بے آب و نان بسر کر دینا فی نفسہٖ لایعنی حرکت ہے اگر اس سے کوئی اخلاقی نتیجہ نہ برآمد ہو، اور اخلاق کا تعلق چونکہ صرف انسان کی اجتماعی زندگی سے ہے، اس لئے اعمال مذہب "اوراد و وظائف"، دعا و توبہ کے رد و قبول کا معیار صرف یہ ہونا چاہئے کہ سب سے زیادہ پابند صوم و صلوٰۃ نے سب سے زیادہ خدمت خلق کی انجام دی ہے یا نہیں اور وہ شخص جس نے تین لاکھ مرتبہ سورۂ مزمل پڑھکر اس کی زکوٰۃ ادا کی ہے، اس نے سوسائٹی کے لئے کس قدر ایثار سے کام لیا —— دُنیا کے تمام مذاہب کا مقصود عبادت و نمایش سے یہ رہا ہو یا کچھ اور، مجھے اس سے بحث نہیں لیکن اسلام کے متعلق مجھے یقین ہے کہ اُس کا نصب العین صرف یہی تھا اور اس نے عبادت کو محض عبادت کے لحاظ سے کبھی اہمیت نہیں دی۔ اس نے نماز کی تعلیم دی صرف اس لئے کہ باہمی اتحاد و تعاون پیدا ہو، اس نے روزہ فرض کیا محض اس غرض سے کہ ہم میں ابنا جنس کے اقتصادی مشکلات کا احساس پیدا ہو، اس نے حج کی ہدایت کی صرف اس مقصود کے ساتھ کہ اسلام کو بین الاقوامی چیز بنایا جائے، اس نے ادائے زکوٰۃ کو لازم قرار دیا فقط اس مدعا کے ساتھ کہ قوم کا ایک مرکزی بیت المال قائم رہے لیکن افسوس ہے کہ عہد رسالت قوم کے اس عظیم الشان تعمیری پروگرام کو پورا کرنے کے لئے بہت مختصر ثابت ہوا اور عہد خلفاء میں بھی بعض سیاسی اختلافات کی وجہ سے اس کی بنیاد مضبوط نہ ہو سکی —— یہاں تک کہ آخر کار بنو امیہ کا دور ملوکیت شروع ہو گیا اور اسلام کی روحِ اجتماعیت و انسان پرستی، ہوس ملک گیری اور تکمیل استبداد و سرمایہ داری میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔

اسلام نے زعامت دینی و دنیوی (Jempral and Spiritual power) کی تفریق اسی لئے گوارا نہیں کی کہ ملوکانہ استعمار و استدراک کی خواہش لوگوں میں پیدا نہ ہو اور ایک قائد و رہنما، یا سلطان و فرمانروا کی خصوصیت یہ نہ قرار پائے کہ وہ ملک کا سب سے بڑا سرمایہ دار ہے بلکہ اس کے لئے وجہ امتیاز یہ ہو کہ وہ ملک و قوم کا سب سے زیادہ جفاکش خادم ہو اور تقسیم دولت میں وہ اسی سطح پر نظر آتا ہے جہاں دوسرے افراد قوم پائے جاتے ہیں —— پھر تاریخ شاہد ہے کہ اس لحاظ سے رسول اللہ کی زندگی کیا تھی اور آپ کے بعد خلفاء راشدین نے کس حد تک اس اُصول کی پابندی کی —— لیکن جب

عہد امیر معاویہ شروع ہوا تو حکومتِ اسلام ختم ہو کر حکومتِ عرب قائم ہوئی اور اسلام کی ظاہری پابندی صرف اس لئے قائم رکھی گئی کہ مصلحت کا اقتضا یہی تھا[1]۔ الغرض اسلام کی صحیح تعلیم سے روشناس ہوئے دنیا کو مشکل سے ایک ربع صدی کا زمانہ گزرا ہوگا کہ واقعات و حالات نے اسے محو کرنا شروع کیا اور زعامت دنیوی کے ساتھ ساتھ زعامت دینی سلاطین اسلام کی اتنی ضعیف ہوگئی کہ آخر کار پبلک پر اثر قائم رکھنے کے لئے ایک جماعت علماء مذہب کی علحدہ ایسی پیدا کی گئی جو حکومت کا ساتھ دینے والی ہو اور جسکی وساطت سے دنیاوی حکومت کو مضبوط بنایا جائے۔ چنانچہ تاریخ کے صفحات ایسے واقعات سے لبریز ہیں کہ علماء مذہب نے سلاطین و امراء کے اغراض پورا کرنے کے لئے حدیثیں وضع کیں، واقعات تاریخ کو مسخ کیا اور شریعت میں بہت سی ایسی تبدیلیاں کیں جو فرمانروائے وقت کے اغراض و مصالح کی تکمیل کیلئے ضروری تھیں۔ ہر چند علماء سلف میں بعض ایسے نفوس بھی تھے جنھوں نے اپنے ضمیر کے خلاف کہنا کبھی گوارا نہیں کیا۔ (مثلاً جناب ابوحنیفہ کہ انھوں نے امویین و عباسیین دونوں کے کوڑے کھانا محض اس لئے گوارا کئے کہ وہ خلافت کا مستحق صرف علویین کو قرار دیتے تھے) لیکن عنصر غالب انھیں علماء کا تھا جن کا علم دین حاکم وقت کی خواہشوں کے مطابق ہر رنگ میں ڈھل جاتا تھا اور جن کے احکام و فتاوی کو شاہان وقت بہ جبر ملک میں رائج کرتے تھے، چنانچہ فقہ حنفی کا ابو یوسف کے فتاوی کے مطابق مدون ہونا اور ان کے اُستاد ابو حنیفہ کے اقوال پر عملدرآمد نہ ہونا اس کی کھلی ہوئی مثال ہے۔

الغرض جب فرمانروائے وقت کی دینی کمزوریوں کے اثرات کو دور کرنے کے لئے علماء مذہب کی خدمات حاصل کی گئیں تو اسکا نتیجہ یہی ہونا چاہئے تھا کہ اسلام کی وہ روح فنا ہو جائے جو شاہ و گدا کے امتیاز کو مٹانے والی تھی، جو بنی نوع انسان میں حریت و مساوات کا ذوق پیدا کرنا چاہتی تھی اور جو سرمایہ داری کی اسی لئے مخالف تھی کہ اس سے افرادِ قوم میں بالکل غلط اُصول پر تفریق مدارج قائم ہوتی ہے۔

اس کے بعد جب رفتہ رفتہ حکومت دنیوی ضعیف ہونے لگی اور اسی کے ساتھ علماء مذہب کا وہ جاہ و جلال بھی مٹنے لگا جو حمایتِ حکومت کی وجہ سے انھیں حاصل ہوا تھا، تو انھیں فکر لاحق ہوئی کہ اس سیادت کو کیونکر قائم رکھا جائے اور اس طرح اسلام میں سب سے پہلے "ادارۂ کہانت" کی بنیاد پڑی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام رفتہ رفتہ مذہب کے حقیقی مفہوم سے بیگانہ ہوگئے اور دین اسلام نام رہگیا صرف اُن باتوں کا جو ہمارے علماء بتائیں اور مذہبی لٹریچر کو شجر ممنوع قرار دیکر عوام کو اس کے مطالعہ سے روکا گیا، تاکہ وہ ہمیشہ علماء دین کے محتاج رہیں اور خود اُن میں غور و فکر کی صلاحیت کبھی نہ پیدا ہو۔

اس وقت جو حالت ہمارے ہندوستان کے علماء کرام کی ہے وہ اس کاہنانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے نہ صرف بہ لحاظ نفسیات

---

[1] امیر معاویہ نے عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد اہل مدینہ سے جن الفاظ میں خطاب کیا تھا ان سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام سے امیر معاویہ کو کتنی محبت تھی وہ الفاظ ملاحظہ ہوں:۔ "ولقد رضت لکم نفسی علی عمل ابی قحافۃ (ابی بکر) و اردتہا علی عمل عمر۔ فنفرت من ذلک نفاراً شدیداً و اردت علی ثنیات عثمان فابت علی۔ فسلکت بہا طریقاً لی ولکم فیہ منفعۃ، مواکلۃ حسنۃ و مشاربۃ جمیلۃ فان لم تجدونی خیرکم فانی خیر لکم ولایۃ۔"

بلکہ ظاہری وضع و صورت کے اعتبار سے بھی انھوں نے اپنے آپ کو قوم کے دوسرے افراد سے جُدا کر لیا ہے اور اس طرح اپنے و عوام کے درمیان "بینھما برزخ لا یبغیان" کی ایسی زبردست حدِ فاصل کھینچ رکھی ہے کہ اس کے دور ہونے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

اس میں شک نہیں کہ ہر قوم اور ہر جماعت کے لئے ایک قاید و رہنما کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور عوام کی ذہنیت کو گمراہی سے بچانے کے لئے کسی نہ کسی ایسے دماغ کا پایا جانا لازم ہے جو ان پر خاص اقتدار رکھتا ہو۔ اسی کے ساتھ یہ بھی بالکل درست ہے کہ ایک پابند مذہب جماعت کے لئے یہ خدمت بہترین طور پر وہی شخص انجام دے سکتا ہے جو مذہبی اقتدار رکھتا ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مذہبی سیادت کا کیا مفہوم ہے اور ہندوستان کے علماء اسلام اس سے کیا کام لے رہے ہیں۔

یوں تو مذہب بظاہر نام ہے صرف چند مخصوص عقاید کا، لیکن مقصود بالذات محض عقاید نہیں ہیں بلکہ اُن کی وساطت سے ایک غرض مشترک ایک مرکز اجتماع پیدا کرنا ہے اور اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر جب ہم اپنے علماء کرام کے اعمال و افعال کا جایزہ لیتے ہیں تو ہم کو یہ فیصلہ کرنے میں دشواری ہوتی ہے کہ انھوں نے اسلام کے مفہوم کو واقعتاً سمجھا بھی ہے یا نہیں۔ ہمارے علماء مختلف مدارج و اقسام کے ہیں۔ ایک تو سب سے ادنیٰ قسم قرآن حفظ کرکے اور فقہ کی چند کتابیں پڑھکر "امامت" کی حد سے آگے نہیں بڑھتے اور مسجد کے حجرہ میں بظاہر راہبانہ زندگی بسر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرا درجہ ان علماء کا ہے جو درس و تدریس کی چھوٹی چھوٹی نوکریاں کرتے ہیں اور تعلیم قدامت پرستی سے قوم کے بچوں کا دماغ خراب کرنے کے لئے ایسا زیادہ معاوضہ بھی نہیں لیتے، تیسرا درجہ ان معلمین و اساتذہ کا ہے جو قومی تعلیمگاہوں میں فضیلت کی پگڑی تقسیم کرنے کے ذمہ دار ہیں اور بہ سلسلۂ مسایل شرعیہ وہ احکام صادر کیا کرتے ہیں جن کا تعلق صدہا سال قبل کے تمدن سے ہے، چوتھا درجہ ان علماء کا ہے جنھوں نے بیعت توبہ و سلوک کے ادارے قائم کر رکھے ہیں اور جو خود تو "فنا فی اللہ" ہونے کے مدعی ہیں، لیکن اپنے مریدوں کو "فنا فی الشیخ" کے درجہ سے آگے بڑھنا خلاف مصلحت سمجھتے ہیں۔ پانچواں اور غالباً سب سے اعلیٰ درجہ ان علماء کا ہے جو سیاسیات میں حصہ لینے کے مدعی ہیں اور جنھوں نے اس غرض کے لئے "جمعیتیں" بھی قائم کر رکھی ہیں۔

خیر اول دو قسم کے مولویوں کو چھوڑئے کیونکہ ممکن ہے ان کو علماء کے گروہ میں شامل ہی نہ کیا جائے لیکن غایت و نتیجہ کے لحاظ سے موخر الذکر تین قسم کے علماء بھی ہم کو ویسے ہی نظر آتے ہیں اور ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے، جس نے مسلمانوں کی تمدنی و معاشری اقتصادی و اجتماعی زندگی کی اصلاح کو اپنے لائحۂ عمل میں شامل کیا۔ اول تو خود ان میں باہمدگر ایسی حریفانہ کشمکش پائی جاتی ہے کہ عوام کے لئے یہ فیصلہ دشوار ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کس کے خلوص پر اعتبار کیا جائے، جمعیتہ العلماء کانپور کی ہدایت پر عمل کیا جائے یا جمعیۃ العلماء دہلی کے مشورہ پر۔ لیکن اگر یہ اختلاف و تصادم نہ ہو تو بھی ان کے وجود کا کوئی افادی پہلو ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ اگر شہر کے بھشتی، معمار اور کفش دوز باقی نہ رہیں تو لوگوں کو واقعی بہت تکلیف پہونچے، لیکن اگر مولویوں کی جماعت فنا ہو جائے تو قوم کو کیا نقصان پہونچ سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ نماز روزہ کا رواج کم ہو جائیگا،

مسجدیں ویران ہو جائیں گی، بالفاظ دیگر یہ کہ روحانیت مفقود ہو جائے گی، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر روحانیت نام اسی نکبت و ذلت کا ہے جو اسوقت ہندوستان کے مسلمانوں پر طاری ہے اور صوم و صلوٰۃ کا رواج یا مسجدوں کی آبادی و رونق موجودہ علمار کرام کی سرکردگی میں اسی قسم کی روحانیت پیدا کر سکتی ہے، تو عذاب الٰہی کس چیز کا نام رکھا جائے گا اور قہر خداوندی کی اور کیا صورت قرار پائے گی۔

یہ امر غور طلب ہے کہ قرون اولیٰ میں بھی جب مسلمانوں کی ترقی سیلاب کی طرح بڑھ رہی تھی، بالکل یہی نماز تھی اور یہی قیام و قعود، یہی روزہ تھا اور یہی اسحار و افطار، پھر اب کیا ہوا جو طاعت و گناہ کسی میں وہ لذت باقی نہ رہی۔ اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ پہلے نمازیں پڑھی جاتی تھیں اصلاح نفس و اعمال کے لئے، احیار قومیت کے لئے، احساس اجتماعیت کے لئے، اور اب طاعت و عبادت بے روح ہے، بے مقصود ہے۔ کوئی منزل سامنے نہیں، کوئی ہدف پیش نظر نہیں، پہلے مسلمان نماز پڑھتا تھا تو دنیا ہی میں طرح فردوس ڈالتا تھا، اپنے لئے یہیں حور و قصور پیدا کر لیتا تھا اور اب وہ سب کچھ "وعدۂ فردا" کی اُمید پر کرتا ہے، اور اسلام کو اس دنیا سے بالکل علٰحدہ کر کے اس آخرت سے متعلق سمجھتا ہے جہاں نہ سوال جد و جہد کا ہے نہ سعی و عمل کا اور یہ وہ ذہنیت ہے جو اسلام کے غلط مفہوم کی تبلیغ سے پیدا ہوئی ہے اور جس کے ذمہ دار یقیناً ہمارے مذہبی علمار ہیں

بعض حضرات انسانی ترقی کو دنیاوی فتوحات سے بالکل علٰحدہ سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اسلام کا مدعا کسی سلطنت کا قیام یا حکومت کی بنیاد ڈالنا نہ تھا، لیکن ایسا کہنا نہ صرف واقعات کی تکذیب ہے بلکہ اسلامی تعلیم کی بھی مخالفت کرنا ہے۔ رسول اللہ اور خلفار کا جنگ کر کے لوگوں کو مسلمان بنانا، مال غنیمت کو مجاہدین میں تقسیم کرنا، مفتوحہ ممالک کی آمدنی سے بیت المال قائم کرنا اسی لئے تھا کہ عربوں یا مسلمانوں کی حکومت دنیا میں قائم ہو اور غالباً یہ کوئی گناہ نہ تھا کیونکہ ایک قوم کے استعلار کا کوئی مفہوم متعین ہو ہی نہیں سکتا جب تک اُس کا کوئی خاص اقتدار قایم نہ ہو اور یہ اقتدار یقیناً اسی دنیا سے متعلق ہونا چاہئے، ورنہ مرنے کے بعد جب نہ سوال مسابقت کا ہوگا، نہ سعی و نتیجہ کا اگر محض استعلار روحانی ہوا بھی تو بیکار ہے اور اس کی تعلیم و تلقین اس عالم میں کوئی معنی نہیں رکھتی۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ دنیا کے بعض مذاہب نے صرف روحانی پاکیزگی ہی کو اپنا اصل مقصد قرار دیا تھا اور اس دنیا میں تکلیفیں اُٹھا اُٹھا کر ختم ہو جانے کو حیات ابدی بتایا، لیکن اسلام کی تعلیم یہ نہ تھی، اس نے اپنا مذہبی آئین اسی دنیا سے متعلق رکھا اور تمام وہ تدابیر بتائیں جو ایک قوم کی زندگی کو من حیث القوم کامیاب بنا سکتی ہیں، اس نے اگر اخوت و ہمدردی کی تعلیم دی تو دوسری طرف دشمنوں سے جنگ کرنے کا بھی حکم دیا اور اگر اس نے یہ بتایا کہ نجات، روحانی کا ذریعہ اخلاق کی پاکیزگی ہے تو اسی کے ساتھ یہ راز بھی ظاہر کر دیا کہ:-

"جس نے اس دنیا میں اندھوں کی طرح زندگی بسر کی وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا"

لیکن افسوس ہے کہ ہمارے علمار کرام نے تعلیمات اسلامی میں سے صرف روزہ و نماز کو لے لیا، لیکن اس جوش عمل اور اس ولولۂ ترقی کو نظر انداز کر دیا جس کے پیدا کرنے کے لئے، طاعت و عبادت کی پابندیاں پیدا کی گئی تھیں، انھوں نے دوزخ کے اژدہے اور جنت کی حوریں تو یاد رکھیں، لیکن اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ جہنم میں جو چیز اژدہا بن کر ڈسنے والی ہے وہ اسی نکبت و ذلت

کی دوسری صورت ہے جو اس دنیا میں کسی قوم پر مستولی ہو جاتی ہے اور جس لذت کو حور کہا جاتا ہے وہ اُسی استعلاء و ترقی کا نام ہے جسکے بدولت ایک جماعت اسی دنیا کو جنت بنا لیتی ہے۔

آج ہمارے علماء کرام ہم سے نمازیں تو پڑھوا لیتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتے کہ کس نعمت کے شکریہ میں ان متواتر سجدوں کا خراج ہم سے وصول کیا جاتا ہے۔۔ روزے تو ہم پر ہر سال مسلط کر دیتے ہیں مگر اس کی کوئی تدبیر نہیں بتاتے کہ احترام ماہ صیام کے احساس کے لئے گزشتہ گیارہ مہینوں تک شکم سیر ہو کر کھانے کے ذرایع مسلمان کو کیونکر حاصل ہو سکتے ہیں — اور اگر یہ کہا جائے کہ حصول نعمت و رزق کا ذریعہ یہی ہے، تو پھر ہم کو معلوم ہونا چاہئے کہ آج یہ ذریعہ کیوں بیکار ہو کر رہ گیا ہے اور علماء کرام کو چھوڑ کر وہی لوگ کیوں زیادہ نکبت زدہ نظر آتے ہیں جو زیادہ نمازیں پڑھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مذہبی رہنماؤں نے اسلام کے فلسفہ کو سمجھا ہی نہیں اور غالباً وہ کبھی نہ سمجھ سکیں گے کہ اسلام کا مفہوم یکسر سعی و عمل ہے اور اصل عبادت وہی ہے جو ہر وقت ہمارے دماغ و جوارح کو متحرک رکھ کر ہم کو اپنی زندگی کا ثبوت دینے پر مجبور کرتی رہے۔

اسلام نے عاقبت کے بورئے سمیٹنے کی تعلیم کبھی نہیں دی، اس نے یہ کبھی نہیں بتایا کہ "نیکی کر اور دریا میں ڈال"۔ اس نے زمین کی طنابیں کھینچکر دنیا پر چھا جانے کا درس دیا، اس نے اچھے کام کر کے یہیں ان سے فائدہ اُٹھانے کی ترکیبیں بتائیں اور یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ آخرت کی کھیتی اسی دنیا میں بوئی جاتی ہے اور فردوس کے قصور بلند بام کی بنیادیں بھی اسی عالم آب و گل میں استوار کی جاتی ہیں۔

پھر غور کرو کہ تمہارے علماء تمھیں کیا بتاتے ہیں، اور ان کی تعلیم کیا ہے۔ اگر وہ واقعی تمھارے اندر کوئی قومی احساس پیدا کر کے اس کارزار عالم میں تمھارے ساتھ رہکر جنگ کرنے کے لئے طیار ہیں تو بیشک ان کی تقلید کرو، اور کورانہ تقلید کرو، لیکن اگر وہ تمھاری دنیا کو مٹا کر صرف تمھارے دین کے رہبر بننا چاہتے ہیں، تو باور کرو کہ ان کی رہبری گمراہی ہے اور ان کی قیادت بربادی — ان کی طرف سے منھ موڑ لو، ان کے بتوں کو توڑ ڈالو اور خود سمجھنے کی کوشش کرو کہ تمھارے رسول نے تمھیں کیا بنانا چاہا تھا اور اب تم ان ہلویان غیر ہدایت یافتہ کے زیر اثر بگڑ کر کیا ہو گئے ہو۔

خریداران نگار سے ایک التجا

یوں تو ہر ماہ نگار کم از کم پچاس ساٹھ کی تعداد میں ڈاک خانہ کی بدنظمی کے نذر ہو جایا کرتا ہے لیکن اس مرتبہ جنوری ۱۹۳۵ء کے نگار پر جو غارتگری ہوئی ہے، وہ یقیناً ناقابل برداشت ہے — پھر تماشہ یہ ہے کہ ناظرین نگار باوجود اس علم کے کہ پرچہ ہر ماہ کے اول ہفتہ میں ضرور شایع ہوتا ہے اور حسب اعلان ہر ماہ کی ۲۵ تک لا ناپرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع دیدینی چاہئے، اب بھی مکرر جنوری کا پرچہ طلب فرمارہے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم اسکی تعمیل سے قاصر ہیں۔ جس احتیاط سے رسالہ روانہ کیا جاتا ہے اس کا علم صرف ہم کو ہے۔ پھر بھی ۲۵ تک ہم دوبارہ مفت بھیجنے کے لئے طیار رہیں، لیکن جب آپ تاریخ کے اندر اطلاع دینے کی تکلیف بھی گوارا نہ کریں تو ہم معذور ہیں۔

منیجر نگار

پارسی اہلِ کتاب ہیں

حضرت زردشت اپنے عہد کے برگزیدہ پیغمبر تھے

تمہید

ہزار سال قبل مسیح سے ابتک روئے زمین پر بے شمار تغیرات رونما ہوئے لیکن پارسی قوم کی تاریخ بجائے اس کے کہ دنیا کو اُسکی حقیقت کا علم ہوتا بدستور تاریکی کے پردہ میں پوشیدہ رہی،

دین زرتشت کے اُصول سمجھنے میں لوگوں کو جسقدر غلط فہمی ہوئی ہے اسقدر شاید ہی کسی اور مذہب کے سمجھنے میں ہوئی ہو۔ اس کا زیادہ قوی سبب یہ ہے کہ تمام وہ کتابیں جو اس مذہب کے متعلق معلومات پہونچانے میں معین ہو سکتی تھیں قدیم دار السلطنت ایران (استخر) کی غارتگری و تباہی کے وقت برباد ہو گئیں۔ علاوہ ازیں پیروان زرتشت کی طبیعت چونکہ تبلیغ سے ہمیشہ علٰحدہ رہی ہے اس لئے دیگر ممالک کے رہنے والے اس مذہب کے آئین و اُصول سے ناواقف رہے۔

مندرجۂ بالا اسباب کے ماتحت ایران کی قدیم و ابتدائی تاریخ کے متعلق ہمیں فردوسی کے شاہنامہ پر جو قدیم روایات کے حامل ہونے کی وجہ سے اس قدر مشہور و مستند ہے بھروسہ کرنا پڑتا ہے اور جہاں تک خالص تاریخی واقعات کا تعلق ہے ہمیں دیگر ممالک کے ادیب و مصنفین اور عرب مورخین کی تصانیف سے مدد لینی پڑتی ہے۔

مغربی مصنفین نے ایران اور اُس کے قدیم تمدن کے حالات قلمبند کرتے وقت ایرانیوں کے قدیم مذہب کا بھی کچھ ذکر کیا ہے ورنہ مشرق کے اہل قلم نے جن کی جبلّی عادت سوائے اپنے مذہب کے دوسرے مذاہب کا حال رقم کرنے سے گریز کرنے پر مجبور کرتی ہے اس قدیم مذہب زرتشت کا حال رقم کرنے سے ہمیشہ پرہیز کیا ہے۔

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ زرتشتی مذہب جس کے پیرو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں اور جن کو اپنے وطن میں ایکہزار برس سے زائد عرصہ تک سکون و اطمینان نصیب نہ ہوا کیونکر قایم رہ سکا۔ اس باب میں ڈی۔ مینانٹ کا خیال غالباً صحیح ہے کہ:[1]-

"یہ مذہب باوجود گوناگوں مصائب کا مقابلہ کرنے کے ہنوز ایک مقررہ اُصول کا حامل ہے اور اس کے

[1] دائرۃ المعارف دین و اخلاق جلد ۹ صفحہ ۶۴۶۔

کی دوسری صورت ہے جو اس دنیا میں کسی قوم پر مستولی ہو جاتی ہے اور جس لذت کو حور کہا جاتا ہے وہ اُسی استعلاء و ترقی کا نام ہے جسکے بدولت ایک جماعت اسی دنیا کو جنت بنا لیتی ہے۔

آج ہمارے علماء کرام ہم سے نمازیں تو پڑھوا لیتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتے کہ کس نعمت کے شکریہ میں ان متواتر سجدوں کا خراج ہم سے وصول کیا جاتا ہے۔۔ روزے تو ہم پر ہر سال مسلط کر دیتے ہیں مگر اس کی کوئی تدبیر نہیں بتاتے کہ احترام ماہ صیام کے احساس کے لئے گزشتہ گیارہ مہینوں تک شکم سیر ہو کر کھانے کے ذرایع مسلمان کو کیونکر حاصل ہو سکتے ہیں — اور اگر یہ کہا جائے کہ حصول نعمت و رزق کا ذریعہ یہی ہے، تو پھر ہم کو معلوم ہونا چاہئے کہ آج یہ ذریعہ کیوں بیکار ہو کر رہ گیا ہے اور (علماء کرام کو چھوڑ کر) وہی لوگ کیوں زیادہ نکبت زدہ نظر آتے ہیں جو زیادہ نمازیں پڑھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مذہبی رہنماؤں نے اسلام کے فلسفہ کو سمجھا ہی نہیں اور غالباً وہ کبھی نہ سمجھ سکیں گے کہ اسلام کا مفہوم یکسر سعی و عمل ہے اور اصل عبادت وہی ہے جو ہر وقت ہمارے دماغ و جوارح کو متحرک رکھ کر ہم کو اپنی زندگی کا ثبوت دینے پر مجبور کرتی رہے۔

اسلام نے عاقبت کے بورئے سمیٹنے کی تعلیم کبھی نہیں دی، اس نے یہ کبھی نہیں بتایا کہ "نیکی کر اور دریا میں ڈال"— اس نے زمین کی طنابیں کھینچکر دنیا پر چھا جانے کا درس دیا، اس نے اچھے کام کر کے پہیں ان سے فائدہ اُٹھانے کی ترکیبیں بتائیں اور یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ آخرت کی کھیتی اسی دنیا میں بوئی جاتی ہے اور فردوس کے قصور بلند بام کی بنیادیں بھی اسی عالم آب و گل میں استوار کی جاتی ہیں۔

پھر غور کرو کہ تمہارے علماء تمھیں کیا بتاتے ہیں، اور ان کی تعلیم کیا ہے۔ اگر وہ واقعی تمھارے اندر کوئی قومی احساس پیدا کر کے اس کارزار عالم میں تمھارے ساتھ رہکر جنگ کرنے کے لئے طیار ہیں تو بیشک ان کی تقلید کرو اور کورانہ تقلید کرو، لیکن اگر وہ تمھاری دنیا کو مٹا کر صرف تمہارے دین کے رہبر بننا چاہتے ہیں، تو باور کرو کہ ان کی رہبری گمراہی ہے اور ان کی قیادت بربادی — ان کی طرف سے منھ موڑ لو، ان کے بتوں کو توڑ ڈالو اور خود سمجھنے کی کوشش کرو کہ تمھارے رسول نے تمھیں کیا بنانا چاہا تھا اور اب تم ان ملویان غیر ہدایت یافتہ کے زیر اثر بگڑ کر کیا ہو گئے ہو۔

خریداران نگار سے ایک التجا

یوں تو ہر ماہ نگار کم از کم پچاس ساٹھ کی تعداد میں ڈاک خانہ کی بدنظمی کے نذر ہو جایا کرتا ہے لیکن اس مرتبہ جنوری ۱۹۳۵ء کے نگار پر جو غارتگری ہوئی ہے، وہ یقیناً ناقابل برداشت ہے — پھر تماشہ یہ ہے کہ ناظرین نگار باوجود اس علم کے کہ پرچہ ہر ماہ کے اول ہفتہ میں ضرور شایع ہوتا ہے اور حسب اعلان ہر ماہ کی ۲۵ تک لازماً پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع دیدینی چاہئے، اب بھی مکرر جنوری کا پرچہ طلب فرما رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم اسکی تعمیل سے قاصر ہیں۔ جس احتیاط سے رسالہ روانہ کیا جاتا ہے اس کا علم صرف ہم کو ہے۔ پھر بھی ۲۵ تک ہم دوبارہ مفت بھیجنے کے لئے طیار ہیں، لیکن جب آپ تاریخ کے اندر اطلاع دینے کی تکلیف بھی گوارا نہ کریں تو ہم معذور ہیں۔

منیجر نگار

پارسی اہلِ کتاب ہیں

حضرت زردشت اپنے عہد کے برگزیدہ پیغمبر تھے

تمہید

ہزار سال قبل مسیح سے ابتک روئے زمین پر بے شمار تغیرات رونما ہوئے لیکن پارسی قوم کی تاریخ بجائے اس کے کہ دنیا کو اسکی حقیقت کا علم ہوتا بدستور تاریکی کے پردہ میں پوشیدہ رہی،

دین زرتشت کے اُصول سمجھنے میں لوگوں کو جسقدر غلط فہمی ہوئی ہے اسقدر شاید ہی کسی اور مذہب کے سمجھنے میں ہوئی ہو۔ اس کا زیادہ قوی سبب یہ ہے کہ تمام وہ کتابیں جو اس مذہب کے متعلق معلومات پہونچانے میں معین ہوسکتی تھیں قدیم دارالسلطنت ایران (اصطخر) کی غارتگری و تباہی کے وقت برباد ہوگئیں۔ علاوہ ازیں پیروان زرتشت کی طبیعت چونکہ تبلیغ سے ہمیشہ علٰحدہ رہی ہے اس لئے دیگر ممالک کے رہنے والے اس مذہب کے آئین و اُصول سے ناواقف رہے۔

مندرجۂ بالا اسباب کے ماتحت ایران کی قدیم و ابتدائی تاریخ کے متعلق ہمیں فردوسی کے شاہنامہ پر جو قدیم روایات کے حامل ہونے کی وجہ سے اس قدر مشہور و مستند ہے بھروسہ کرنا پڑتا ہے اور جہاں تک خالص تاریخی واقعات کا تعلق ہے ہمیں دیگر ممالک کے ادیب و مصنفین اور عرب مورخین کی تصانیف سے مدد لینی پڑتی ہے۔

مغربی مصنفین نے ایران اور اُس کے قدیم تمدن کے حالات قلمبند کرتے وقت ایرانیوں کے قدیم مذہب کا بھی کچھ ذکر کیا ہے ورنہ مشرق کے اہل قلم نے جن کی جبلّی عادت سوائے اپنے مذہب کے دوسرے مذاہب کا حال رقم کرنے سے گریز کرنے پر مجبور کرتی ہے اس قدیم مذہب زرتشت کا حال رقم کرنے سے ہمیشہ پرہیز کیا ہے۔

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ زرتشتی مذہب جس کے پیرو اُنگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں اور جن کو اپنے وطن میں ایکہزار برس سے نا ایدہ عرصہ تک سکون و اطمینان نصیب نہ ہوا کیونکر قایم رہسکا۔ اس باب میں ڈی۔ مینانٹ کا خیال غالبًا صحیح ہے کہ[1]:-

"یہ مذہب باوجود گوناگوں مصائب کا مقابلہ کرنے کے ہنوز ایک مقررہ اُصول کا حامل ہے اور اس کے

---

[1] دائرۃ المعارف دین و اخلاق جلد ۹ صفحہ ۵۶۷۔

احکام اوامر و نواہی میں بہت توازن پایا جاتا ہے۔ اس مذہب کی سب سے نمایاں خصوصیت اپنے مذہبی روایات کو قائم رکھنا ہے اور حقیقتاً یہ امر قابلِ ستایش ہے کہ یہ جماعت غیر مذہب والوں میں اس قدر گھُل مِل رہنے کے باوجود اپنے خصوصیات کو محفوظ رکھ سکی اور باوجود اس کے کہ ان کے علماء عبادت خانوں کے اندر اُس زبان میں عبادت کی تعلیم دیا کرتے تھے جس سے پارسی بالکل ناواقف و نابلد تھے یہ اپنے مذہب کے اُصول سے واقف اور اس پر استوار رہ سکے۔

تقریباً تمام مشرقی و مغربی مذاہب کے پیرؤں کا عموماً اور مسلمانوں کا خصوصاً یہ اعتقاد ہے کہ "پارسی" آتش پرست ہیں اور آگ ہی کو تمام عالم کا خالق جانتے ہیں۔ اکثر علمائے مغرب نے اس امر کی سعی کی کہ زرتشت کی زندگی و تعلیم کو تمام اتہامات و غلط فہمیوں سے پاک کر کے اصلی صورت میں منظرِ عام پر لائیں۔ لیکن باوجود ان قابلِ قدر کوششوں کے ابتک عوام کے خیال سے اس بدگمانی اور غلط فہمی کا ازالہ نہ ہو سکا۔ عام مسلمانوں کا بلکہ تعلیم یافتہ حضرات تک کا باستثنائے چندے یہ خیال الیقین کی حد تک پہونچ گیا ہے کہ زرتشتی یزدان پرست نہیں ہیں بلکہ آگ ہی کو اپنا رب و خالق تصور کرتے ہیں۔

اس ناچیز مقالہ کا ماخذ وہی کتب ہیں جو علماء و مورخین کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں اور اسی کے ساتھ اس بات کی بھی ہر امکانی کوشش کی گئی ہے کہ مسلم علماء و فضلاء کے اقوال سے خاص طور پر سند پیش کی جائے تاکہ مسلمان اس حقیقت کو جان لیں کہ حضرت زرتشت حقیقتاً پیغمبر تھے، ایک مصلحِ اعظم تھے جن کی تمام جد و جہد کا اصل مقصود یہی تھا کہ لوگ راہِ راست اختیار کریں۔

دینِ زرتشتی جسے غلطی سے مذہبِ آتش پرستی بھی کہتے ہیں عام طور پر بُت پرست مذاہب میں شمار کیا گیا ہے اور یزدان پرست مذہب صرف تین شمار کئے جاتے ہیں۔ اسلام، نصرانیت اور یہودیت[۱]۔ حالانکہ ان کے اعتقاد بھی قدیم بنی اسرائیل نصاریٰ اور مسلمانوں سے ملتے جلتے ہیں اور ان کا اصل اصول مذہب بھی یہی ہے کہ خدائے واحد جسم و جسمانیات سے منزہ ہے اور اُسے کوئی شخص کسی وقت دیکھ نہیں سکتا[۲]۔ پس اس مخصوص عقیدہ میں زرتشتی مذہب نصرانیت سے جس میں تثلیث پر ایمان بھی شامل ہے یقیناً افضل و برتر ہے۔
مارخم بجا تحریر کرتے ہیں کہ:-

> "اس خیال میں کسی قسم کے شبہ کی گنجایش نہیں ہے کہ ذی فہم ایرانی خدائے وحدہٗ لاشریک کی پرستش کیا کرتے تھے اور صدیوں تک ایسا ہی کرتے رہے اور یہ بات حد درجہ قابلِ ستایش ہے کہ تمام اقوامِ عالم میں ایرانیوں ہی کی وہ قوم ہے جس نے کبھی کسی زمانہ میں کسی قسم کے خود ساختہ اصنام کی پرستش نہیں کی[۳]"

۱؎ مضامین ہاگ و سیڈیا مصنفہ راگزن و اشعار قدیم ایران مصنفہ مولٹن ۲؎ شرحِ زردشتی مصنفہ دھلا و تاریخ پارسیاں مصنفہ کارکا
۳؎ تاریخ ایران صفحہ ۸ ۔

اس میں شک نہیں کہ پارسی آگ اور روشنی کی بے حد عزت کرتے ہیں لیکن کوئی شخص عام اس سے کہ وہ یہودی ہو، نصاریٰ یا مسلمان اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ خدا کی کوئی صورت نہیں ہے اور وہ سرچشمۂ نور ہے۔ انجیل میں مرقوم ہے کہ خداوند نے سب سے پہلے روشنی پیدا کی[1] اور خدا خود نور ہے[2]۔ علاوہ ازیں خدا آتش برباد کنندہ ہے[3]۔ جنت کی وہ مخلوق جس کے سپرد یہوا کے تخت کو سنبھالے رہنا ہے مثل جلتی ہوئی آگ کے شعلہ کے ہے[4]۔ یہوا کو نذر و قربانی دینے کا ذریعہ آگ کو خیال کرتے تھے اسی لئے قانون موسوی کا شدید حکم تھا کہ قربان گاہ کے پاس آگ ہمیشہ روشن رہنی چاہئے[5]۔

اسی طرح قرآن حکیم میں خدا کو "نور الارض والسماوات" بتایا ہے[6]۔ آگ ہی کی تلاش میں جناب موسیٰ کو نبوت ملی[7]۔ وادی طور میں جب حضرت موسیٰ آگ کے قریب پہونچے تو ایک آواز سُنائی دی کہ "اے موسیٰ بلاشبہ میں تمھارا خدا ہوں اور یہ وادیٔ مقدس ہے پس اپنے جوتوں کو اُتار دو[8]"۔

الغرض چونکہ آگ خداوند کریم کی پیدا کی ہوئی اشیا میں نہایت جلیل القدر چیز ہے لہذا آگ کا قابل عزت ہونا ظاہر ہے۔

اُصول دین زرتشت سے ناواقفیت کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ زرتشتیوں پر یہ الزام رکھتے ہیں کہ یہ دو خداؤں پر ایمان رکھتے ہیں اور خدا کی "دوئی" کے قائل ہیں۔ یعنی ایک خدا یزدان ہے جو نیکی کی جانب رہنمائی کرتا ہے اور دوسرا اہرمن جو بدی اور برائی کا سبب ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے معاملات میں خود مختار ہے اور ہر دو برابر کے شریک ہیں یا یوں کہئے کہ دو بادشاہ ہیں جو ایک ہی سلطنت میں انتظام کرتے ہیں لیکن ہر ایک کا طریق سلطنت جدا و مختلف ہے۔ ہم اس سلسلہ میں ڈاکٹر جیمس مولٹن کے خیالات پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں[9] موصوف لکھتے ہیں کہ:-

"نیکی اور بدی کا وجود زرتشت کے نزدیک بھی بالکل ایسا ہی ہے جیسا یہود، نصاریٰ اور مسلم کے نزدیک یعنی مذہب زردشت میں نیکی کا آخر میں غالب آنا اسی طرح پر مذکور ہے جیسا کہ انجیل و توریت میں البتہ یہ ضرور ہے کہ زرتشت نے اس خیال کو اپنے مخصوص انداز میں ظاہر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اولین دو روحوں میں سے ایک نے نیکی اختیار کی اور دوسری نے بدی۔ اور پھر ان دونوں میں ضد و اختلاف ہونے کے باعث جنگ شروع ہوئی جس کا اختتام اُسوقت ہوگا جب بدی اور اُس کے متعلقات بالکل فنا ہو جائینگے اس جنگ میں انسان کو بھی شرکت کرنا پڑیگی اور پاک زندگی، عبادت، راستی اور مسلسل جانفشانیوں کی اعانت سے بدی کی حکومت کا خاتمہ کرنا پڑیگا[10]۔ زردشت کی تعلیم یہ تھی کہ اہورامزدا ہر شے کا تنہا خالق ہے

---

[1] باب اول سفر پیدائش آیۃ ۳ - [2] کتاب اشعیا باب دہم، اہفتم ۸ - [3] سفر تثنیہ باب چہارم آیۃ ۲۴ - [4] کتاب حزقیال نبی باب اول آیۃ ۱۳ - [5] سفر لاویان۔ باب ششم آیۃ ۱۲ - ۱۳ - [6] سورۂ ۲۴ - آیۃ ۳۵ - اللّٰہ نور السموات والارض - [7] سورۂ ۲۰ آیۃ ۱۲ - [8] فلما اتیھا نودی یا موسیٰ انی الخ - [9] ملاحظہ ہو کتاب "ادیان واشعار ایران" باب پنجم "تاریخ ایران مؤلفہ ملکم صفحہ ۵۹ و مضمون بہ کتاب دائرۃ المعارف دین و اخلاق جلد ۱۲ صفحہ ۸۶۲ - [10] ان کلمات کو قرآن حکیم کے اُن آیات سے مطابق کیجئے سورۂ ۱۳ آیۃ ۲۲ - سورۂ ۲۲ آیۃ ۹۶ -

لیکن جب وہ نیکی سی کوئی قوت خلق کرتاہے تو خود بخود اس کی ضد یعنی بدی کی روح وجود میں آجاتی ہے[۱] یہ خیال عربی کی اس مشہور مثل سے بھی ظاہر ہے کہ ہر شئے اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے[۲]۔"

قرآن شریف میں بھی ہدایت کی گئی ہے۔ انسان کو چاہئے نیک و بد میں تمیز کرے۔ یہ شیطان ہے جو برائی کی طرف لیجاتا ہے اور اس طرح پر بندوں کے امن وامان میں فرق ڈال دیتا ہے[۳] الغرض اس تعلیم میں یہیں آئین زرتشت اور دیگر انبیا کے اُصول میں بہت کم فرق نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر وسٹ نے خوب لکھا ہے کہ:۔

"اس خیال کی تصدیق محال ہے کہ دین زرتشت میں مسیحیت سے زیادہ دوئی کی بو ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب زردشت لوگوں کے پرانے معتقدات کا مصلح تھا۔ آریا اکثر عناصر فطرت کو شخصی حیثیت دیکر "دیو" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ اِس لفظ کا ماخذ آریا لفظ "دیو" ہے جس کے معنی چمکنا ہے اور اسی لقب سے وید میں دیگر معبودوں کو یاد کیا گیا ہے[۴]۔ جس وقت مصلح اعظم زرتشت کی پیدائش ایران میں ہوئی اُسوقت اس سرزمین کا معیار روحانیت اس قدر پست ہو گیا تھا کہ بجائے خالق کی پرستش کرنے کے لوگ مختلف عناصر کی جو خود مخلوق تھے پرستش کیا کرتے تھے پس اس مصلحت و دوراندیشی کے ماتحت کہ واحد حقیقی و وحدانیت اپنی جگہ پر محفوظ رہ سکے زرتشت نے "دیو" کو بدی سے منسوب کر دیا اور اس طرح پر اوستا و دیگر پارسی مذہبی ادبیات میں یہ لفظ قایم رہا۔ وید مذہب نے دیو پرستی کو باقی رکھا۔ لیکن مذہب زرتشتی نے اس اہورا یعنی خدائے واحد کی پرستش کو رواج دیا۔ اہورا یا اشورا جیسے الفاظ وید میں بھی کئی جگہ اچھے معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں۔ کہیں کہیں وید میں یہ الفاظ فرشتوں کا مفہوم بھی ادا کرتے ہیں۔ وید کے "اندرا" کا ذکر "وندیداد" سلسلۂ شیاطین میں کیا گیا ہے۔ اور وید کے سورج دیوتا کا شمار "اوستا" میں فرشتوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ وید کے ایک اور معبود ارین کا ذکر زرتشتی اعتقاد میں[۵] اہرمن کے نام سے پایا جاتا ہے۔

(۲)

زردشت

آج سے سیکڑوں سال قبل جب مشرق میں انسان عناصر فطرت کی پرستش فرض سمجھ رہا تھا[۶]۔ جب ہندوستان کے دیوتاؤں نے

---

[۱] برائے مطابقت قرآن سورۂ ۹ آیۃ ۸۳ تا ۸۰۔ [۲] علامہ غلام حسین کنتوری مرحوم نے اپنی کتاب انتصار الاسلام میں اس بحث پر کہ خدا کو نیکی اور بدی ہر دو کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی بڑی خوبصورتی وخوبی سے بحث کی ہے۔ [۳] سورۂ ۷ آیۃ ۱۲۰ و ۲۶۔ [۴] تعلیمات زردشت صفحہ ۴۲ و کتاب شرح مذہب زردشت مؤلفہ دھلا صفحہ ۷۔ [۵] تاریخ ایران مصنفہ مارخم صفحہ ۵۴-۵۳۔ دین ایرانیان مولفہ ڈاکٹر ٹایل باب ہفتم و پانچ عظیم الشان سلطنتیں مصنفہ راولنسن جلد ۴ صفحہ ۹۶-۹۴۔ [۶] ناسخ التواریخ حصۂ اول جلد اول۔ شرح مذہب زردشت۔ "میڈیا" مصنفہ راگزن و کتاب زردشت پیغمبران ایران قدیم مصنفہ جیکسن۔

رشیوں پر الہام کے سلسلہ کو موقوف کر دیا تھا، جب یہودیت اصل اُصول سے علٰحدہ ہو چکی تھی۔ جب بودھ کے اصول "نروان" کی ترویج وجود میں نہ آئی تھی، جب دنیا میں عیسیٰ مریم کی ولادت نہ ہوئی تھی، جب صحرائے عرب زندگی و نجات کے سرچشمے سے محروم تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے جب کفر و ضلالت کا عالم میں دور دورہ تھا اور لوگ صراط مستقیم سے دور ہو کر ایک خضر کی ضرورت محسوس کر رہے تھے اسوقت ایران کے ایک گوشہ سے ایسی روشنی نمودار ہوئی جس کا ظہور اس سے پیشتر عالم کے کسی حصہ آب و گل پر اسقدر پر نور صورت میں نہ ہوا تھا جس وقت مغرب اور مشرق کے ممالک اُس دور حیات سے گزر رہے تھے جس کی تاریخ کا پتہ ہمیں نہیں ملتا اسوقت دریائے دُرجی (جو جبلِ جبر سے نکل کر بہتی تھی) کے کنارے ایک بستی موسومہ میڈیا آباد تھی اور اُسی مسعود بستی کے اقبالمند خاندان اسپتاما میں زردشت کی پیدائش ہوئی۔ زرتشت ابھی ماں کی گود ہی میں پرورش پا رہے تھے کہ لوگ احترام کا خراج آیندہ ہونے والے نبی کی خدمت میں بصورت محبت پیش کرنے لگے۔[۱]

حضرت زرتشت کی تاریخ پیدائش کا صحیح اندازہ ابتک نہیں ہو سکا۔ علمائے مغرب و مشرق کو اختلاف ہے اور خود پارسی فضلاء تاریخ پیدائش کے متعلق متفق نظر نہیں آتے۔ لیکن باوجود تاریخ ولادت کے نامعلوم ہونے کے تمام مورخین و محققین زرتشت کی ایک تاریخی شخصیت ہونے کا اقرار کرتے ہیں اور کسی کو اُن کے وجود سے انکار نہیں ہے۔[۲] عام طور پر لوگوں کا اتفاق ہے کہ عہد زرتشت جناب مسیح کی پیدائش سے ایکہزار سال قبل کا زمانہ ہے۔ ڈاکٹر ہاگ رقمطراز ہیں کہ:-

"ہم کسی طرح پر بھی یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ زرتشت کو گزرے ہوئے حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے ایکہزار سال سے کم عرصہ ہوا ہے۔ اگر لوگ ایکہزار سال قبل پیدائش مسیح سے زائد بھی بتائیں تو بڑی حد تک صحیح ہونے کا گمان ہے۔"

زرتشت نامہ کے مشہور مصنف نے یونانی اور یہودی مصنفین کے بیانات کے علاوہ کونیفورم کے کتبوں کو بطور دلیل پیش کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ زرتشت کا زمانہ ۱۳۰۰ صدی قبل مسیح ہے اور گلڈنر کے خیال میں عہد زرتشت چودہ سو سال قبل پیدائش مسیح ہے۔

بہر حال اگر ہم مندرجۂ بالا مصنفین کے دلایل و بیانات کو غیر صحیح تصور کرلیں تو بھی سب سے قریب تاریخ ....

...... پانچ چھ سو سال قبل مسیح کی قرار پاتی ہے۔[۳] چنانچہ پروفیسر ولیمس جیکسن کے خیال میں زرتشت کم از کم چھ سو سال قبل

---

[۱] دایرۃ المعارف برطانیہ جلد ۲۴ نہم ایڈیشن۔ ملل و النحل مصنفہ شہرستانی۔ مجمل البلدان مؤلفۂ یاقوت میں مرقوم ہے کہ جائے پیدائش زرتشت شہر "ارومیہ" ہے۔ [۲] مروج الذہب تالیف مسعودی صفحہ ۱۱۰۔ کتاب الفصل فی الملل والنحل مؤلفۂ امام ابی محمد بن احمد بن حزم جلد اول صفحہ ۱۱۲۔ تاریخ الکامل مؤلفۂ ابن الاثیر۔ جلد اول صفحہ ۱۱۲ ۔ و ناسخ التواریخ حصۂ اول جلد اول صفحہ ۱۹ - ۱۲ ۵ -
[۳] میڈیا مصنفہ راگزن فصل دوم۔ دایرۃ المعارف برطانیہ جلد ۲۴ و تاریخ ادبیات ایران مصنفۂ ایڈورڈ براؤن۔ جلد اول صفحہ ۲۶۔

پیدائش حضرت عیسیٰ گزرے ہیں اور اُن کا زمانہ گوتم بودھ سے تھوڑے ہی عرصہ قبل کا ہے۔

آریا اور ایرانی دونوں قومیں مناظرِ فطرت سے بے حد متاثر ہو رہی تھیں، اور عناصرِ فطرت کی پرستش میں نہایت غلو سے کام لے رہی تھیں، اگر بودھ آریاؤں کے لئے مصلح ثابت ہوئے تو زرتشت ایرانیوں کے واسطے رہبر و رہنما بنے۔ اگر بودھ کی تعلیم کا خلاصہ دنیا سے کنارہ کشی اور سکون و خاموشی تھا تو زرتشت کا خلاصۂ تعلیم جد و جہد اصلاح و عمل اور پاکبازی تھا[1]۔ آج زرتشت کو محققین، اُن انبیاء کی فہرست میں بھی سب سے پہلی جگہ دیتے ہیں جنھوں نے انسان اور خدا کے درمیان تعلقات کی تشریح کی۔ حضرت زرتشت کی ذات وہ اولین ذات ہے جس نے آریاؤں پر خدا کے وجود کو بوضاحت ظاہر کیا۔ اس جگہ ہم رابندرناتھ ٹیگور کے خیالات کو جو انھوں نے اس سلسلہ میں ظاہر فرمائے ہیں نقل کرتے ہیں[2]، وہ لکھتے ہیں کہ:۔

”تاریخ ایران کا سب سے درخشاں باب وہ واقعہ ہے جب زرتشت نے مذہب کی اصلاح کی۔ اس امر سے شاید کسی کو انکار نہ ہوگا کہ جہاں تک ہمارے معلومات کا تعلق ہے زرتشت ہی پہلے شخص ہیں، جنہوں نے مستقل طور پر اخلاقی مذہب کا راستہ بتا کر خدا کی وحدانیت کی وہ تبلیغ فرمائی جو نیکی کی اساس اولین ہے۔ قدیم مذاہب، انسان کو اُن اُصول کا پابند رکھنا چاہتے تھے جن کا تعلق بیرونی تجربات و مشاہدات پر تھا۔۔۔ زرتشت اُن انبیاء میں تھے جنھوں نے انسان کو راہِ آزادی دکھا کر نیک و بد کی تمیز میں آسانی فراہم کی اور مہمل رسوم کی بیجا پابندی سے چھٹکارا دلا کر مندروں اور معبدوں کے گورکھ دھندوں سے پاک کیا، بہت اولوالعزم نظر آتے ہیں۔“

لفظ زرتشت پر بہت سے علماء نے بحث و تحقیق کی ہے[3]۔ زرتشت کا تعلق کسی پست طبقہ سے نہ تھا۔ اُن کا خاندانی سلسلہ فریدوں شاہ ایران سے ملتا ہے جو پیشدادیان نسل سے متعلق تھا۔ ذیل میں ہم حضرت زرتشت کا نسب نامہ درج کرتے ہیں[4]:۔ زرتشت ابن پورشاسپا ابن پیترسپ، ابن اُرغداسپ ابن ہیکاتسیو ابن کیخنش ابن پیتراسپ ابن آریجادُھرشن ابن ہردہرا ابن اسپتامن ابن ویدست ابن آیاظم ابن ایرگ ابن دراس رووبو ابن مانش سہر۔

پورشاسپا اور دوغدوئے پیارے فرزند زرتشت[5] کو جب وحی ہوئی کہ خدا کے بندوں کو صراط مستقیم کی طرف دعوت دیں، تو وہ اس پر آمادہ ہو گئے۔ اور انھوں نے صانع حقیقی کا راز جو ان پر بذریعہ الہام و وحی منکشف ہو رہا تھا عام مخلوق پر ظاہر کر دیا۔

---

[1] زردشت پیغمبر ایران مصنفہ پروفیسر ولیم جیکسن۔ [2] ملاحظہ فرمائیے رسالہ ”وسوا بھارتی“ اکتوبر ۱۹۲۳ء (رسالہ سہ ماہی)۔ [3] تاریخ پارسیان جلد دوم۔ ”زردشت“ مصنفہ جیکسن۔ عہد اوستا در زردشت مصنفہ گیگر و اسپیجل۔ دین ایرانیان باب نہم۔ [4] کتاب ”زردشت“ صفحہ ۹، ۱۸۔ عہد اوستا صفحہ ۱۰۔ مروج الذہب صفحہ ۱۱۰۔ ناسخ التواریخ۔ یہ سب کتب بوضاحت اس مسئلہ پر بحث کرتے اور نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ منوچہر خاندان پیشدادیان ایرانی سے تھا اور فریدوں کا جانشین تھا۔ [5] تاریخ پارسیان جلد ۲۔ ملل والنحل صفحہ ۱۰۵۔ دایرۃ المعارف دین و اخلاق جلد ۱۲ صفحہ ۸۶۔

زردشت کے ابتدائی حالات اوران کی ابتدائی تبلیغی سرگرمیوں کا حال کتابوں سے کچھ نہیں معلوم ہوتا - اوستا سے محض اسقدر پتہ چلتا ہے کہ بچپن میں وہ وطن کے کسی قریبی پہاڑ پر چلے جایا کرتے تھے اور وہیں بیٹھ کر غور وخوض میں مشغول رہتے تھے - اسی عالم میں ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہوجاتی تھی[1] - ان پر تیس سال کی عمر میں وحی نازل ہوئی - اول اول انھوں نے اپنے دین کے اصول کی تبلیغ اپنے ہمسایوں میں کی اور جب کچھ لوگ اُن کے پیرو ہوچکے تو اُنھوں نے بلخ کا رُخ کیا جو ایران کا دارالسلطنت تھا اور جہاں گشتاسپ حکمران تھا دربار شاہی میں پہونچکر زرتشت نے تمام امراء اور حاضرین دربار کے سامنے اپنے پیغام کی اصلیت اور نئے مذہب کے اُصول کی حقیقت کو ثابت کیا - اُس عقلمند بادشاہ نے اس نئے مذہب کی عظمت اور سچائی سے مطمئن ہوکر فوراً اس مذہب کو قبول کرلیا[2] - اور اکثر امراء بھی اس نئے مذہب کی طرف مائل ہوگئے -

جب گشتاسپ نے اس مذہب کو اختیار کرلیا تو دین زرتشتی، سلطنت کا مذہب ہوگیا اور عام تبلیغ شروع ہوگئی -

فراشوشترا اور جاماسپا جو پیغمبر کے اولین شاگرد تھے ایران کے مختلف حصص میں زرتشت کے پیامبر اور مبلغ بنکر سیاحت کرنے لگے - اور اکثر لوگوں نے اس نئے مذہب کو قبول کرلیا[3] - ہمیں یہ معلومات مقدس کتاب اوستا سے حاصل ہوئے ہیں لیکن زرتشت کی آخر حصۂ عمر کی کارگزاریوں کے متعلق اوستا ساکت ہے - پہلوی ادبیات سے ہمیں اسقدر پتہ ملتا ہے کہ ۷۷ سال کی عمر میں ایک روز صبح کے وقت جب زرتشت عبادت ونماز میں مشغول تھے بادشاہ آرجسپ کے ایک سپہ سالار نے جو اس دین زرتشتی سے متنفر تھا کسی تیز اوزار کو زرتشت پر پھینک مارا اور وہی زخم پیغمبر کی موت کا باعث ہوا[4] -

قاتل یعنی براتروکش بھی زندہ نہ رہسکا کیونکہ زرتشت نے باوجود موت کی جانکنی میں مبتلا ہونے کے اپنی تسبیح کو اُس پر پھینکا اور اُسکے پھندے میں اُسے اُلجھا کر مار ڈالا -

حضرت زرتشت نے تین شادیاں کی تھیں اور اُن شادیوں سے کئی لڑکے اور لڑکیاں پیدا ہوئیں - ان اولاد کے متعلق ہمیں اوستا اور پہلوی ادبیات سے بہت کچھ معلومات حاصل ہوتے ہیں - گاتھا[5] کے ایک حصہ میں (یسنا ۵۳ دوم) حضرت زرتشت کی ایک صاحبزادی موسومہ پوروچستا کے بیاہ کا حال جو پیغمبر کے ایک خاص شاگرد جاماسپا سے ہوا تھا مذکور ہے[6] - خود پیغمبر نے ہاوُوئی سے شادی کی تھی - ہاوُوئی کا باپ فروشسترا، زردشت کا شاگرد تھا اور اس مذہب کا مشہور مبلغ تھا - یاشت سے پتہ چلتا ہے کہ فروشسترا گشتاسپ کے

---

[1] یہی حال تقریباً تمام انبیا کا ہے - موسیٰ قبل درجۂ رسالت پر پہونچنے کے کوہ طور جاتے اور حضرت محمد مصطفیٰ کوہ حرا میں عبادت فرمایا کرتے تھے - [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو - ابن الاثیر - تاریخ الکامل - مروج الذہب - تاریخ طبری کتاب الملل والنحل - دائرۃ المعارف برطانیہ دائرۃ المعارف دین واخلاق - تاریخ ایران مصنفۂ مالکم - ناسخ التواریخ - دین ایرانیان مصنفۂ ٹائل - عہد اوستا و زردشت - شرع مذہب زردشت مصنفۂ مانکجی دھلا اور تاریخ پارسیان مصنفہ کاکا [3] شرع مذہب زردشت اور ناسخ التواریخ - [4] تاریخ پارسیان جلد دوم - زردشت مصنفۂ جیکسن اور عہد اوستا مصنفۂ سنجو - [5] تاریخ پارسیان اشعار قدیم ایران اور ناسخ التواریخ - [6] تالیفات مولٹن ومقالۂ گلڈنر (دائرۃ المعارف برطانیہ) وناسخ التواریخ وغیرہ ملاحظہ فرمایئے - جو دعا پیغمبر کی صاحبزادی نے بوقت عروسی پڑھی تھی وہی دُعا ابتک ہر پارسی عروس برائے برکت پڑھا کرتی ہے -

شاہی دربار کا ایک رکن تھا۔ گاتھا میں اُسے اس مذہب کا معروف معاون و مددگار بتایا گیا ہے۔ جیسا کہ ہر نئے مذہب کو اول اول مصائب کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اُسی طرح دینِ زرتشتی کو بھی ابتدائی دور میں گوناگوں دقتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اس مذہب کا شدید مخالف دیو پرستوں کا فرقہ تھا۔ اِس فرقے نے اپنی تمام کوشش اس امر میں صرف کردی کہ اس مذہب کی مقدس و پاکیزہ تعلیم کو جھوٹ اور غلط ثابت کرے لیکن فروشسترا اور جماسپا کی جدوجہد نے تمام مخالفوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا۔[1]

توران کے بادشاہ ارجاسپ نے جو اہورامزدا پر ایمان نہ رکھتا تھا، گشتاسپ کے خلاف جنگ کا اعلان کیا۔ گشتاسپ نے جو دینِ زرتشتی کا پیرو تھا بڑے جوش و خروش سے ارجاسپ کا مقابلہ کیا۔ ارجاسپ نے دو بار ایران پر فوج کشی کی۔ ایک بار سنہ ۶۰۱ قبل مسیح[2] میں گشتاسپ کی فوج کو اسفندیار پسر گشتاسپ کی سپہ سالاری میں فتح حاصل ہوئی اور دوبارہ سنہ ۵۸۳ قبل مسیح میں ہر چند ان فتوحات سے جو مسرت دینِ زرتشتی کے پیرووں کو ہوئی تھی وہ زرتشت کے قتل کے باعث رنج و ملال سے مبدل ہوگئی۔ تاہم اس مذہب کی تبلیغی رفتار پر کوئی اثر نہ پڑا اور بادشاہ ایردشیر کا نام ولایتی ممالک میں دینِ زرتشتی کی تبلیغ کے سلسلہ میں ہنوز زبان زد خلائق ہے۔ اخمینیوں نے دینِ زرتشتی کو ایران کا قومی مذہب قرار دیا۔ سیرس اور دارائے اعظم نے اور بھی ترقیاں کیں اور خصوصیت کے ساتھ ساسانیوں نے تو اس کا بہت ساتھ دیا۔

(مترجم) سید وجاہت حسین ام اے پروفیسر طاہر رضوی - ام - اے

مکتوبات نیاز

کی کتابت و طباعت کا کام جنوری کے رسالہ کی وجہ سے بند ہوگیا تھا لیکن اب پھر شروع کر دیا گیا ہے اور اپریل تک اس کی اشاعت کی توقع کی جاتی ہے۔

جن حضرات کی پیشگی رقم وصول ہوگئی ہے وہ مطمئن رہیں کہ کتاب شایع ہوتے ہی ان کے نام روانہ کردی جائے گی۔

بعض حضرات نے بغیر رقم بھیجے ہوئے صرف نام درج کرایا ہے، لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ محض نام درج کرا لینا رعایتی قیمت سے فائدہ اُٹھانے کا مستحق قرار نہیں دیتا۔ ضرورت ہے کہ دو روپیہ پیشگی بھیجدیا جائے ــــ ورنہ اشاعت کے بعد ان کو تقریباً اس سے دوچند ادا کرنا پڑے گا۔

غالباً اس کے اظہار کرنے کی ضرورت نہیں کہ ادب اُردو میں یہ مجموعہ کیا چیز ہوگا اور اس سے محروم رہنا، اُردو کے اُس صنفِ انشا سے محروم رہنا ہوگا جس کی نظیر اس وقت تک پیش نہیں کی جاسکتی۔

منیجر نگار

---

[1] تاریخ پارسیان - میڈیا - نورِ ایران قدیم مصنفہ پیتہ والا۔ [2] زردشت مصنفہ جیکسن اور علم الاساطیر ایرانیان مؤلفہ کرنائی و تاریخ ایران مصنفہ مالکم و عہد اوستا

محبت کی یادگار

کشوری بڑی ہنس مکھ اور نیک خصلت لڑکی تھی۔ گو وہ یوں بہت مالدار نہ تھی مگر حُسن کی دولت سے مالامال تھی، سب اُسے گاؤں کی رانی کہتے تھے۔ اب اس نے بارھویں سال میں قدم رکھا تھا ایک دن صبح کے وقت وہ اپنے گھر کے سامنے نیم کے پیڑ کے نیچے چبوترہ پر بیٹھی بڑی خوش الحانی سے رامائن کا پاٹ کر رہی تھی کہ اُدھر سے گاؤں کے زمیندار کا لڑکا جسونت گزرا، آج بہت دنوں کے بعد کشوری نے جسونت کو دیکھا تو وہ بہت خوش ہوئی دونوں لڑکپن کے ساتھی تھے گاؤں کے پاٹ شالہ میں دونوں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ پاٹ شالہ کی تعلیم ختم کر کے جسونت بنارس انگریزی پڑھنے چلا گیا اور کشوری اپنی تعلیم کا اور سلسلہ قائم نہ رکھ سکی، جب جسونت گرمیوں کی چھٹیوں میں گاؤں آتا تو کشوری کے لئے بنارس سے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لاتا اس مرتبہ جب وہ کشوری سے ملا تو اس نے ایک چاندی کا تعویذ پیش کیا۔ یہ کوئی بڑی چیز نہ تھی مگر کشوری انکار نہ کر سکی۔ وہ جسونت کو "بھائی" کہتی تھی وہ اُسے دنیا میں سب سے زیادہ لائق عقلمند اور قابل عزت سمجھتی تھی اس کے لئے جسونت ایک "دیوتا" تھا اور وہ دیوتا ہی سمجھکر اپنے دل میں اس کی پوجا کرتی تھی۔ گلے میں تعویذ پہن کر اس نے اس پر ایک اُچٹتی نظر ڈالی "دیوتا" کا تحفہ پاکر کشوری کے دل کی خوشی اس کی آنکھوں سے جھلکنے لگی۔ وہ فوراً اپنی ماں کے پاس دوڑی گئی اور کہا:۔

"ماں! دیکھ تو سہی۔ جسونت بھائی! میرے لئے کیسا خوبصورت تعویذ بنارس سے لائے ہیں۔"

"ہاں! ہاں بہت خوبصورت ہے" ماں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ہاں، بہت خوبصورت ہے۔ مگر جسونت نے تو تجھ ایسی بدصورت لڑکی کو ایسا خوبصورت تعویذ لاکر دیا اور تو نے اس کے بدلہ میں ان کو کچھ بھوجن بھی نہ کرایا۔

اس عرصہ میں جسونت بھی کشوری کی ماں کو پرنام کرنے گھر کے اندر پہونچ گیا اور اس نے کہا:۔ "نہیں ماں! میں ناشتہ کر آیا ہوں پھر کسی دن آکر کھالوں گا۔"

یہ سُن کر کشوری کی بھوئیں تن گئیں اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہوگئی اور اس نے کہا۔ "کیوں نہ کھاؤ گے؟ تم کو ضرور کھانا پڑیگا ورنہ یہ لو اپنا تعویذ واپس لے جاؤ" یہ کہکر کشوری نے اپنے گلے سے تعویذ اُتارنے کی کوشش کی جسونت نے اس کا ہاتھ تھام لیا "بس بس زیادہ غصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ اور یہ لو! آنکھوں میں آنسو بھی آگئے، بڑی پگلی ہے۔۔۔ اس میں رونے کی کون بات ہے خوشی کے وقت آنسو بہانا منحوس ہوتا ہے اچھا لے آ کیا کھلاتی ہے میں ضرور کھاؤں گا۔"

برستا ہوا بادل چھٹ گیا اور آفتاب چمکنے لگا کشوری کے ہونٹوں پر پھر مُسکراہٹ کا راج ہوگیا۔ جب ایک گلاس دودھ پی کر جسونت

رخصت ہونے لگا۔ تو کشوری نے پوچھا "اب کب آؤ گے"۔ جسونت نے کہا۔ "جب تم بلاؤ گی"

"اور اگر میں نہ بلاؤں تو۔" کشوری نے منھ بنا کر کہا

جسونت نے مسکرا کر جواب دیا۔ "تو میں نہ آؤں گا"

کشوری کا چہرہ اُداس ہو گیا اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ اچھی بات ہے جیسی تمھاری خوشی۔ میں غریب تم کو مجبور نہیں کر سکتی۔

جسونت نے دیکھا کہ ہنسی ہنسی میں کشوری پھر روٹھنا چاہتی ہے اس نے خوشامدانہ لہجہ میں کہا۔ میں نے تو یوں ہی ہنسی میں تم کو چھیڑنے کے لئے کہدیا تھا تم بلاؤ چاہے نہ بلاؤ مگر جب کبھی میں بنارس سے چھٹیوں میں یہاں آؤں گا تو تم سے ضرور ملوں گا" یہ کہتا ہوا کشوری سے جسونت رخصت ہو گیا۔

جسونت اور کشوری کے ایسے تعلقات دیکھکر گاؤں والوں کا خیال تھا کہ جب کشوری جوان ہو گی تو اُس کی شادی جسونت ہی کے ساتھ ہو گی لیکن ان کے والدین کے خیالات اور ہی قسم کے تھے۔ کشوری کے ماں باپ غریب تھے وہ سوچتے تھے کہ غریب لڑکی کے ساتھ زمیندار اپنے لڑکے کی شادی کبھی نہ کرے گا لیکن اس کے ساتھ ہی ان کو جسونت سے بہت سی اُمیدیں بھی تھیں وہ سمجھتے تھے کہ ممکن ہے جسونت کی کوشش سے زمیندار شادی کرنے کے لئے تیار ہو جائے ہم غریب ہیں تو کیا لیکن ہمارا خاندان تو معزز و شریف ہے۔ اُدھر جسونت کے والدین نے کبھی یہ سوچنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی کہ وہ اپنے لڑکے کی شادی ایک غریب گھر میں کریں گے ضرور زمیندار تو جسونت کے لئے کشوری کے بجائے کسی راجکماری کی تلاش میں تھا۔

کشوری ان تمام حالات سے بے خبر اپنے "جسونت" کی محبت میں مگن تھی جس دن جسونت نے اس کو تعویذ دیا اس رات کو کشوری خوشی کے مارے اچھی طرح سے سو بھی نہ سکی وہ سوچتی تھی کہ کب سویرا ہو اور وہ اپنی سہیلیوں کو تعویذ دکھائے۔

(۲)

کشوری نے آہستہ آہستہ اُس سہانے سبزہ زار میں قدم رکھا جسے دُنیا "جوانی" کہتی ہے۔ اس کا حُسن و شباب دیکھ دیکھ کر اسکے والدین دل ہی دل میں کڑھتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کشوری کسی غریب جاہل مرد کے پالے پڑے جو اس کی قدر نہ کر سکے۔ جسونت سے وہ نا اُمید ہو چکے تھے اس وقت جسونت بی۔ اے میں پڑھ رہا تھا لیکن وہ گاؤں میں آتا تو حسب معمول کشوری سے ملنے ضرور آتا تھا اور کشوری بھی جیوں جیوں بڑھتی گئی اس کے دل میں جسونت کی محبت بڑھتی گئی، وہ اب جسونت کو خط بھی لکھنے لگی تھی۔ ان دونوں لڑکپن کی بے لوث سادی محبت والوں میں خط و کتابت کا سلسلہ دیکھکر گاؤں والوں نے جھوٹی افواہیں بھی اُڑانی شروع کر دیں اور اس کی خبر اُن کے والدین کو بھی ہو گئی۔ کشوری کے گھر والوں کے لئے یہ بڑی شرم اور بے عزتی کی بات تھی لیکن جسونت کے والدین کے لئے کوئی فکر کی ضرورت نہ تھی۔ اول تو جس افواہ سے غریب کی عزت خاک میں مل جاتی ہے اُسی افواہ سے دولتمند کو کوئی خاص نقصان نہیں پہونچتا دوسرے یوں بھی لڑکے والوں کو بدنامی ہوتے ہوئے بھی سماج میں رہنا مشکل نہیں ہوتا لیکن لڑکی والوں کے لئے تھوڑی سی کانا پھوسی بھی قیامت ہو جاتی ہے سماج میں پھر اُن کو بڑی مشکل سے جگہ ملتی ہے۔ انھیں تمام وجوہ سے کشوری کے والدین نے اپنی لڑکی کا بیاہ

اساڑھ میں کرنے کا انتظام کرلیا۔

جب کشوری کو معلوم ہوا کہ اس کا بیاہ ہونے والا ہے تو اس کے دل میں اُسی قسم کے خیالات آنے لگے جو اس کی ہم عمر لڑکیوں کے دلوں میں شادی ہونے سے کچھ پہلے پیدا ہونے لگتے ہیں، وہ بہت خوش ہوئی اور وہ سوچنے لگی "کچھ دنوں کے بعد اُسے کسی کو خوش کرنا پڑے گا وہ گھر کی ملکہ بنے گی گرہستی کا انتظام کرنا پڑے گا وہ اپنے شوہر کا کمرہ سجائے گی وہ سینے پرونے سے اس کی آمدنی بڑھانے کی کوشش کرے گی — اور ہاں بچوں کو کس طرح کھلائے گی اور سب سے زیادہ خوشی کی بات تو یہ ہوگی کہ اس کا شوہر اُسے کس طرح پیار کرے گا اور وہ اس کے جواب میں اسے کس طرح خوش کرے گی —" اسی قسم کے خیالات سے کنواری لڑکیاں اپنے مستقبل کی دنیا بناتی ہیں یہی ان کی زندگی کا اصلی مقصد ہے انھیں ارمانوں اور اُمیدوں کے ساتھ وہ گرہستی کے آشرم میں قدم رکھتی ہیں۔ اسی قسم کے خیالات کے ساتھ کشوری نے اپنے جسونت کو بھی یاد کیا۔ اور وہ اس خوشی کے موقع پر اس کو ضرور کوئی قیمتی تحفہ نذر کریں گے اور وہ اس تحفہ کو اپنے "پتی دیوتا" کو دکھائے گی آہا وہ کتنا اچھا نظارہ ہوگا۔ ان تمام خیالات کے آتے ہی اس نے 'جسونت' کو لکھا کہ "میرا جلدی بیاہ ہونے والا ہے"، اس نے سوچا تھا کہ خط کے جواب میں جسونت اس کو مبارکباد کا خط لکھیں گے اور آشیرباد دیں گے لیکن خلافِ توقع وہ جسونت کے جواب سے خوش نہ ہو سکی۔ اس نے ایک بار۔ دو بار اور پھر بار بار خط کو پڑھا جس سے اس کے دل پر چوٹ لگی اس نے سوچا کہ جسونت اب اس کو پیار نہیں کرتے اس نے اپنی ماں سے بھی شکایت کی کہ معلوم نہیں کیوں جسونت اب اُس سے پہلی سی محبت نہیں کرتے۔

یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ شادی کا دن نہ بھولی ایک ہفتہ پہلے اس نے پھر جسونت کو لکھا۔ "بھیّا آپ کالج سے کچھ دنوں کی چھٹی لے کر آئیں اور میری شادی میں ضرور شریک ہوں" وہ سوچتی تھی کہ اس مرتبہ جسونت ضرور آئیں گے اور جب وہ آئیں گے تو وہ ان کے چرنوں کی خاک اپنی پیشانی سے لگائے گی اور وہ اُسے آشیرباد دیں گے۔ وہ اس کے لئے بنارس سے ضرور کوئی تحفہ لائیں گے — آہ اب بھیّا سے جدا ہونا پڑے گا معلوم نہیں کتنے دنوں کے لئے؟ —" وہ یہ سب کچھ سوچ کر روتی بھی مگر وہ خوشی کا رونا تھا — واہ ری شادی کی خوشی!

آخر کار زندگی کا وہ قیمتی دن آہی گیا، صبح سے شام تک اگر کشوری کو کسی کی فکر تھی کسی کا خیال تھا تو وہ جسونت تھا۔ شوہر کا زیادہ انتظار نہ تھا کیونکہ اس کو تو آنا ہی تھا اُسے تو جسونت بھیّا کی یاد ستا رہی تھی جن سے جدا ہو کر وہ نئی زندگی گزارنے کے لئے جا رہی تھی۔

وہ جسونت کا انتظار کر رہی تھی۔ دولھا سج کر آیا۔ گاؤں والے بھی اپنے اپنے تحفے لائے اس کی سہیلیاں بھی ہنسی مذاق کرنے کے لئے آگئیں مگر جسونت کا اب تک پتہ نہ تھا۔ شُبھ مہورت بھی آپہونچی "بھونر" کا وقت بھی آگیا لیکن جسونت نہ آیا۔ کشوری گھونگھٹ کاڑھے مہاور لگائے زیوروں سے لدی ہوئی بیاہ کے "منڈپ" کی طرف چلی اس موقع پر بھی اس کی آنکھیں جسونت بھیّا کو تلاش کر رہی تھیں لیکن اس کا کہیں پتہ نہ تھا یکایک اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے لیکن اس کو جسونت کا کہنا یاد آگیا کہ "خوشی کے وقت آنسو بہانا منحوس

ہوتا ہے، یہ سوچتے ہی اس نے اپنے دل کو سنبھال لیا۔ وہ منڈپ میں پہونچ گئی منتر کا جاپ ہوا سنکھ پھونکے گئے اور کچھ دیر کیلئے کشوری بھی اپنا رنج بھول گئی۔

شادی ہو گئی اور کشوری اپنی سہیلیوں۔ لڑکپن کے ساتھیوں اور اپنے والدین سے رخصت ہو کر اپنے پتی دیوتا کے گھر پہونچ گئی،

(۳)

کشوری کا شوہر سکریٹریٹ میں کلرک تھا تھوڑی تنخواہ میں اُسے نو دس آدمیوں کا خرچ اُٹھانا پڑ رہا تھا۔ کشوری کا لڑکپن کچھ آرام سے نہ گزرا تھا شوہر میں آکر بھی اس کا وہی حال رہا مگر وہ ایک ہوشیار لڑکی تھی وہ اپنے شوہر کو اپنی جان سے بھی زیادہ پیار کرتی تھی ساس سسر کی خدمتگزار اور گھر کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے شفیق ماں تھی۔ اس نے اپنی کفایت شعاری سے دو سال تک گھر کا خرچ آمدنی سے زیادہ بڑھنے نہ دیا۔

دیوالی کی چھٹیوں میں سکریٹریٹ بند ہوا جب وہ دفتر سے آج اپنے گھر واپس ہوا تو کشوری نے اپنے شوہر کے چہرہ پر خلاف معمول اُداسی دیکھی جب وہ رات کو اپنے شوہر کے پاس پان لئے ہوئے پہونچی تو اس کے شوہر نے اُسے اپنی طرف کھینچ لیا اور اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ——— "میری کشوری! تمھیں میرے لئے کتنی تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے اگر تم اس جھونپڑی کے بجائے کسی راج محل کی رونق بڑھاتیں تو کتنا اچھا ہوتا"

کشوری نے جلدی سے اپنا ہاتھ اپنے پتی کے منہ پر رکھ دیا اور کہا۔ "پران ناتھ! آپ بار بار ایسا کیوں کہتے ہیں اگر آپ جھونپڑی میں رہتے ہیں تو وہی میرے لئے سُرگ ہے آپ ہی میرے لئے سب کچھ ہیں آپ میرے دیوتا ہیں آپ کی سیوا کرنا ہی میرا دھرم ہے۔ آپ مجھے تو کہتے ہیں لیکن خود اپنی صحت کی کوئی پرواہ نہیں کرتے آپ رنج و فکر میں کمزور ہوتے جا رہے ہیں اگر میں آپ کو آرام نہ پہونچا سکوں تو میرا مرجانا ہی بہتر ہے"

"کیا تم سچ مچ مرنا چاہتی ہو؟ لیکن یہ تو بتاؤ کہ مجھے کس پر چھوڑ جاؤ گی ——— خیر تم پہلے مرو یا میں یہ تو ایشور جانے لیکن دیوالی قریب ہے اس موقع پر مرد اپنی عورتوں کو سونے چاندی کے تحفے دیتے ہیں سچ بتاؤ کہ تم اپنے غریب شوہر سے دیوالی کے دن کیا لینا چاہتی ہو؟"

"میرا شوہر ممکن ہے کہ غریب ہو لیکن محبت میں وہ امیر ہے میں تو اس سے پریم چاہتی ہوں سونے چاندی کی مجھے ضرورت نہیں"

"مگر ایسا نہیں ہو سکتا تم کو کچھ نہ کچھ ضرور قبول کرنا پڑے گا ذرا سوچو تو سہی شادی ہوئے دو سال ہو گئے مگر میں نے اب تک تم کو کچھ بھی نہ دیا اس سال میں تم کو ضرور کوئی زیور بنوا دوں گا۔

کشوری محبت کے آنسوؤں کو نہ روک سکی وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کے شوہر کے پاس روپیہ نہیں ہے بڑی مشکل سے گھر کا خرچ چلتا ہے اس کے لئے اس کی صحت جواب دے رہی ہے زیور بنوانے میں اُسے اور کتنی محنت کرنی پڑے گی ——— اس کے شوہر گوپال نے کشوری کو کھینچ کر اپنے کلیجہ سے لگا لیا۔ کشوری کی آنکھوں میں آنسو کیوں آئے یہ وہ اچھی طرح سے سمجھ گیا اس کی آنکھیں بھی بھر آئیں، گوپال نے پھر کہا "میں تمھارے لئے قیمتی زیور نہ بنوا سکوں گا کیونکہ میرے پاس روپے کم ہیں پھر بھی میں آج تم کو بتاتا ہوں کہ میں نے کچھ روپے جمع کر لئے ہیں تم اپنا وہ چاندی کا تعویذ دیدو میں اس پر سونے کا خول چڑھوا دوں گا اس میں خرچ بھی زیادہ نہ لگے گا۔ تم اسکو کل ضرور اُتار دینا"

کشوری نے آہستہ سے جواب دیا۔ "میرے سرتاج! آپ ضد کیوں کرتے ہیں آپ نے جو کچھ جمع کیا ہے اس سے اپنا علاج کرایئے"

گوپال نے کچھ دیر خاموش رہ کر کہا۔ "میں اور علاج کراؤں نہیں۔ کل میں تم کو ضرور تحفہ دوں گا"

"پران ناتھ! کیا یہ آپ کی انتہائی ضد نہیں ہے"

"ہرگز نہیں۔ تم ابھی اپنے گلے سے تعویذ اُتار دو" یہ کہکر تعویذ اُتارنے لگا۔

پہلے تو کشوری نے اُسے روکنا چاہا مگر جب گوپال نہ مانا تو اس نے کہا۔ "کئی سال ہو چکے جسونت بھیا نے مجھے یہ تحفہ دیا تھا میں انکی یادگار کو جدا نہیں کرنا چاہتی"

"میں تو اُسے سونے سے مڑھوا دوں گا"

"لیکن اس سے اس کی اصلیت چھپ جائے گی اس کا رنگ بدل جائے گا آپ ایسے کام میں کیوں فضول خرچ کرنا چاہتے ہیں جس کو میں ناپسند کرتی ہوں"۔

"کیا وہ اتنا قیمتی ہے کیا تم میری خواہش کو پورا نہ ہونے دو گی"

"میرے مالک! میں آپ کے حکم کے خلاف نہیں چلنا چاہتی پھر بھی میں بتانا چاہتی ہوں کہ یہ تعویذ میرے جسونت بھیا کے محبت کی یادگار ہے اس لئے میں آپ کی بات نہیں مانتی"

گوپال خاموش ہو گیا اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا کشوری نے یہ سب کچھ دیکھا مگر وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ گوپال نے تھوڑی دیر کے بعد کشوری کو آہستہ سے ڈھکیل دیا۔ کشوری پھر بھی اس کے پاس تھوڑی دیر تک بیٹھی رہی اس کی آنکھوں سے کچھ آنسو نکل پڑے اس نے گہری سانس لی اور دھیرے سے اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی ——— رنگ میں بھنگ ہوتے دیر نہیں لگتی۔

(۴)

گوپال نے بڑی مشکل سے کچھ روپئے جمع کئے تھے وہ اس سے کشوری کے لئے کوئی تحفہ خریدنا چاہتا تھا لیکن کشوری نے انکار کر دیا کشوری کو کیا معلوم تھا کہ وہ اپنے انکار سے گوپال کے دل کو کتنا صدمہ پہونچائے گی۔ آج کشوری نے اپنے شوہر کی مدت کی آرزو پر اپنے انکار سے پانی پھیر دیا۔ گوپال نے کشوری اور جسونت کے تعلقات کے متعلق کچھ باتیں سُنی تھیں لیکن اس کے دل پر پہلے اس کا کچھ اثر نہ ہوا تھا کیونکہ کشوری کی محبت کی وجہ سے گوپال کے دل میں کسی قسم کی بدگمانی پیدا ہی نہ ہو سکی لیکن جب گوپال محبت کی نیند سے چونکا تو محبت کا وہ شوخ رنگ پھیکا نظر آیا۔ جس کو وہ پہلے پری حور اور دیوی سمجھ رہا تھا اب وہ کسی اور رنگ میں نظر آنے لگی۔ محبت کی ترنگ میں عیب بھی ہنر معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا نشہ اُترتے ہی ہنر بھی عیب معلوم ہونے لگتا ہے محبت والے ایک دوسرے کی غلطیاں تلاش کرنے لگتے ہیں اگر ایسی حالت میں اس کے دل میں بدگمانی اپنا گھر بنا لیتی ہے تو ساری زندگی برباد ہو جاتی ہے ساری خوشیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے

گوپال نے گاؤں والوں سے کشوری کے متعلق بہت سی افواہیں سُنی تھیں لیکن وہ ان افواہوں کو بھول گیا تھا اس کی کچھ کچھ یاد اسکے دل کے کسی گوشہ میں باقی تھی۔ شادی ہونے کے بعد بھی کشوری جسونت کو خط لکھا کرتی تھی بعد میں گوپال کے خیال سے اس نے خط و کتابت

بند کر دی تھی اس سے گوپال کو کسی قسم کی غلط فہمی یا بدگمانی نہ ہو سکی لیکن اب جبکہ جسونت کا پھر نام لیا گیا اور کشوری نے جسونت کے تحفہ کو جدا کرنے سے انکار کیا تو گوپال کے دل میں بدگمانی نے اپنی جگہ بنالی اور اس کو پورا یقین ہو گیا کہ کشوری شادی سے پہلے ہی جسونت کو پیار نہیں کرتی تھی بلکہ اب بھی وہ اُسی طرح سے جسونت سے محبت رکھتی ہے انتہا یہ ہے کہ وہ اس کے سامنے اپنے شوہر کی بھی کوئی پرواہ نہیں کرتی۔ "آہ وہ کتنی بے شرم ہے کہ جسونت کا نام لیکر مجھ سے کہتی ہے کہ یہ تعویذ ان کی محبت کی یادگار ہے۔ اُف یہ ناقابل برداشت بات ہے اس زندگی سے تو موت بہتر ہے" تمام رات گوپال کو اسی فکر میں نیند نہ آئی صبح ہوتے ہی اس کی طبیعت خراب ہو گئی وہ دن بھر بستر ہی پر پڑا رہا رفتہ رفتہ اس کی حالت ایسی خراب ہوئی کہ وہ ایک ہفتہ پلنگ سے نہ اُٹھ سکا۔

اب تک کشوری نہ سمجھ سکی کہ گوپال کی بیماری کی اصل وجہ کیا تھی وہ سمجھتی تھی کہ چونکہ اس کا شوہر بہت محنت کرتا ہے اسی سے اسکی طبیعت خراب ہو گئی اسی خیال سے تعویذ مٹھانے کے بدلے اس نے دوا لانے کے لئے گوپال سے کہا تھا۔ وہ اس سے بے خبر تھی کہ اس کا شوہر غیرت اور بدگمانی کی آگ میں جل رہا ہے۔ جب وہ گوپال کے پاس جاتی تو گوپال اُسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا۔ کشوری اپنے شوہر کا یہ حال دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی آخر کار اس نے سوچا کہ ان کی خفگی کی اصل وجہ یہ تعویذ ہے اس کو یہ پتہ نہ تھا کہ گوپال کے کانوں میں گاؤں کی کچھ افواہیں پہونچ چکی تھیں۔ اس نے اب تعویذ کو پارسل کے ذریعہ سے جسونت کے پاس واپس کرنے کا ارادہ کیا مگر یہ سوچتے ہی کہ یہ تحفہ ان "جسونت بھیا" کا ہے جن کو وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے لیکن ہندوستانی عورتوں کے لئے شوہر کی خوشی ہی دنیا کی سب چیزوں سے پیاری ہوتی ہے اس لئے کشوری نے تعویذ کو واپس کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا لیکن یہ سوچ کر کہ ڈاک کے ذریعہ سے بھیجنے میں "جسونت بھیا" کو بُرا لگے گا اس نے ان کو خط لکھ کر اپنے یہاں بُلانے اور سب باتیں اچھی طرح سے سمجھا کر تعویذ واپس کرنے کا ارادہ کیا۔

گوپال کی حالت روز بروز خراب ہونے لگی جب وہ دفتر میں کام کرنے بیٹھتا تو کشوری اور جسونت کی باتیں سوچ سوچ کر وہ ایسا پریشان ہوتا کہ سرکاری کام میں غلطیاں ہو جاتیں ایک دن جب وہ دفتر سے گھر واپس ہوا تو اس نے کشوری کو اپنے پاس بُلایا اور پیار سے اس کی طرف دیکھنے لگا وہ سوچنے لگا۔ "آہ ایسی معصوم صورت عورت کیا کوئی پاپ کر سکتی ہے نہیں میری بدگمانی فضول ہے"

عرصہ کے بعد کشوری نے جو اپنے شوہر کی محبت بھری نگاہیں دیکھیں تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ گوپال نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا منھ اوپر اُٹھایا اور کلیجہ سے لگا کر اس سے پوچھا۔ "ہردیشوری! کیوں روتی ہو" بہت دنوں کے بعد کشوری نے اپنے شوہر کی زبان سے محبت بھری باتیں سنیں عرصہ کے بعد گوپال نے اس کو اپنے سینہ سے لگایا تھا رُکے ہوئے آنسو ایکدم اُمنڈ پڑے اس سے جتنا رویا گیا وہ روئی گوپال کا بھی دل بھر آیا۔ مگر وہ رے شکی مزاج مرد گوپال نے بہت نرمی سے کشوری سے دریافت کیا۔ "سچ بتاؤ کیا تم میں اور جسونت میں کوئی خراب تعلق تھا" آسمان سے گویا بجلی گر پڑی یکایک کشوری کے آنسو خشک ہو گئے وہ حیرت سے اپنے شوہر کی طرف دیکھنے لگی اور وہ یہ نہ سوچ سکی کہ اسے ایسے موقع پر کیا کرنا چاہئے اس کا سر چکرانے لگا اس کی قسمت میں شوہر کی زبان سے ایسے شرمناک الفاظ کا سننا لکھا تھا جبکہ شادی ہوئے تین سال ہو چکے تھے کیا کوئی بہن اپنے بڑے بھائی سے ناجائز تعلق رکھ سکتی ہے شدت رنج و غم سے وہ اپنے شوہر کے قدموں پر گر پڑی اس کا

دل پھٹا جاتا تھا اس نے اپنے شوہر کے قدموں کو زور سے اپنی چھاتی سے چپکا لیا وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکی۔

لیکن کشوری کی اس حالت سے گوپال کی بدگمانی بڑھ گئی وہ کشوری کی صداقت اور سچائی کا اندازہ ہی نہ لگا سکا اس نے سوچا کہ کشوری شرم اور ڈر کے مارے سرنگوں ہے کیونکہ اس کا راز کھل گیا ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ میرے قدموں پر کیوں گرتی۔ گوپال کی بدگمانی بڑھتی ہی گئی پھر بھی اسوقت اس نے کشوری پر رحم ہی کیا۔ واہ ری انسان کی عقل! اس دنیا میں عورت اور مرد ایک دوسرے کو کبھی اچھی طرح سے نہ پہچان سکیں گے۔

(۵)

کشوری کو اب معلوم ہوگیا کہ اس کا شوہر اس سے کیوں بدگمان ہے اس کو اب اپنے شوہر کو اپنا منھ دکھانا بھی اچھا نہ معلوم ہوتا تھا وہ جب کبھی اپنے شوہر کے کمرہ میں جاتی تو سوچتی کہ اس کا شوہر اس کے بارے میں ایسی باتیں سوچتا ہوگا جن کا خواب میں بھی اُسے خیال نہ تھا وہ شرم اور غیرت کے مارے زمین میں گڑی جاتی تھی اس نے اپنے شوہر سے ایک لفظ بھی نہ کہا وہ ہر وقت یہی سوچا کرتی تھی کہ اس کے شوہر نے ایسی ذلیل بات کیوں سوچی اُسے اب ہر چیز سے نفرت ہوگئی اس کی تندرستی بھی خراب رہنے لگی آخر کار اس نے کچھ سوچ کر جسونت بھیا کو لکھا "میں بڑی مصیبت میں ہوں آپ فوراً میری سسرال میں تشریف لائیے" اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اس بار وہ ضرور آئیں گے۔

اس دن خلاف معمول گوپال دفتر سے جلدی آگیا اور بہت تھکا ہوا تھا کشوری سے کھانا لانے کو کہا اور خود پلنگ پر لیٹ گیا۔ کشوری نے جو خط جسونت کو لکھا تھا وہ تکیہ کے نیچے پڑا تھا گوپال کی نظر اس خط پر پڑ گئی پتہ لکھا ہوا تھا مگر خط بند نہ تھا اس کو دیکھتے ہی گوپال کا نازک جسم غصہ کے مارے پیپل کے پتہ کی طرح کانپنے لگا۔ کانپتی ہوئی اُنگلیوں سے اس نے خط کھولا اور پڑھنے لگا۔

"پیارے جسونت بھیا! میں بڑی مصیبت میں ہوں مہربانی کر کے جلدی آ کر میری مدد کیجئے

آپ کی کشوری"

آج گوپال نے چوری پکڑی اس نے سوچا۔ "وہ جسونت کو بلانا چاہتی ہے مصیبت سے چھڑانے کے لئے یعنی اس کو بھگا لے جانے کے لئے اور وہ بھی جلدی۔ وہ اس کے ساتھ جائے گی نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اب معلوم ہوگیا وہ ہمیشہ اسی طرح خط لکھتی رہی ہوگی اور یہ آخری خط ہے جسے میں نے پکڑ لیا۔ بے ایمان۔ بے وفا لڑکی! آہ میں نے اپنے دل کا خون پلا کر اس ناگن کی کیوں پرورش کی کیا اس لئے کہ وہ مجھی کو ڈسے گی"۔ یہ سوچتے ہی گوپال کو اپنی قسمت پر بے اختیار رونا آگیا وہ سوچنے لگا۔ "اس فاحشہ سے میں نے شادی ہی کیوں کی۔ اگر اس وقت جسونت مل جائے تو میں اس کا خون پی لوں ہاں میں اس وقت تک انتظار کروں گا جب تک یہ چٹھی اسکے پاس پہونچے اور وہ یہاں آئے اب مجھے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں" وہ کمرہ سے نکل کر باہر ہوگیا۔

گوپال کے جانے کے کچھ دیر کے بعد جب کشوری کھانا لے کر آئی تو اسے یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ اس کا شوہر کمرہ میں نہیں ہے وہ اُداس ہو کر اس کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ ایک گھنٹہ گزر گیا لیکن وہ واپس نہ آیا اس کو اب اپنے اس خط کی یاد آئی جو اس نے جسونت کے نام لکھا تھا۔ تکیہ اُٹھا کر اس نے دیکھا تو جس طرح سے وہ رکھ گئی تھی وہ اُسی طرح سے رکھا تھا اس نے اس خط کو فوراً

ڈاکخانہ میں بھجوا دیا۔

کافی رات گزرنے کے بعد گوپال گھر واپس ہوا انسان کب تک ایسے صدمے برداشت کر سکتا ہے گوپال کا دل جل رہا تھا نہ اُسے گھر میں چین تھا نہ باہر اس لئے اب وہ موت کی راہ دیکھ رہا تھا وہ ایسا معلوم ہونے لگا گویا وہ برسوں کا بیمار ہے کشوری نے بھی اُسے دیکھا اور آنسو بہائے لیکن پرماتما کی لیلا کو کون جان سکتا ہے۔ اس دفعہ گوپال پلنگ پر ایسا گرا کہ وہ پھر اُٹھ بھی نہ سکا تیسرے دن "کشوری! کشوری!" کہتا ہوا وہ اس دُنیا سے رخصت ہو گیا۔

چوتھے دن جسونت آ گیا۔ کشوری اپنے سب زیور اُتار چکی تھی جب جسونت آیا تو کشوری نے اپنا سر اس کے چرنوں میں جھکایا اور اس کا تعویذ لیکر کہا:۔ "بھائی صاحب! کیا آپ کو اپنے اس تحفہ کا دھیان ہے جب آپ نے اسے میرے گلے میں پہنایا تھا تو میں رونے لگی تھی اور آپ نے کہا تھا کہ یہ اچھی بات نہیں۔ بھیا آپ کا کہنا سچ ہوا۔ اس لئے اب آپ اسے واپس لے لیں"۔

جسونت رونے لگا وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا اور کہتا بھی کس سے کیونکہ تعویذ کو جسونت کے ہاتھ میں دینے کے ساتھ ہی کشوری کی رُوح بھی اس قید ہستی سے آزاد ہو گئی تھی۔

(ماخوذ از منورما)

اعظم کریوی

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آئندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اُصول پر قایم ہونا ہے الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایکبار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سُنے نہ ہوں گے اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸ر کے مجلد کتاب صرف ۸؍ میں اور غیر مجلد عہ میں ملے گی اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ۸؍ میں اور غیر مجلد ۸؍ میں علاوہ محصول ۸ر کے ملے گی۔

اگر

ارشاد ہو تو کتاب بذریعہ وی۔ پی روانہ کی جائے حجم ۲۷۵ صفحات آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی صراحت ضروری ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

مصطفےٰ کمال کی زندگی کے چند دلچسپ اوراق

(مسلسل)

جسوقت مصطفےٰ کمال اپنے مخالفین میں سے بعض کو موت کے گھاٹ اُتار کر اور بعض کو جلا وطن کرکے فارغ ہوا تو اُس نے اطمینان کی سانس لی، اور اب اس نے محسوس کیا کہ وہ پوری آزادی کے ساتھ خود مختارانہ انداز سے عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے قابل ہوا ہے۔

اس وقت ملک کی سیاسی حالت یہ تھی کہ حکومت کی تمام مشینری جمعیت ملیہ کے ہاتھ میں تھی اور دفتر کے ادنیٰ کلرک سے لیکر کابینہ کے وزیر تک تمام عمال حکومت وہی تھے جنھیں اس جمعیت کے ممبر ہونے کا فخر حاصل تھا۔ اضلاع کا انتظام بھی اسی جمعیت کی شاخوں سے متعلق تھا جو اہم معاملات میں مرکزی کمیٹی سے رائے لیتی تھیں۔ اس جمعیت کی تشکیل بالکل فوجی اُصول پر ہوئی تھی اور اسی لئے وہ مصطفےٰ کمال کی حد درجہ مطیع تھی۔

چونکہ کوئی مقابل جماعت دوسری موجود نہ تھی اس لئے انھیں میں سے وزراء کا انتخاب ہوتا تھا اور اسمبلی کے نائبین Deputies کا بھی ہر چند یہ انتخاب ووٹ کے ذریعہ سے ہوتا تھا لیکن چونکہ کوئی دوسرا متقابل گروہ موجود ہی نہ تھا اس لئے یہ انتخاب بھی گویا بالکل نامزدگی کی صورت رکھتا تھا اور جس کو مصطفےٰ کمال چاہتا تھا اسی کا انتخاب ہوتا تھا۔ نائبین کو علاوہ معقول تنخواہوں کے کیشنوں کے سلسلہ میں معاوضے بھی کافی دئے جاتے تھے اور اس طرح گویا وہ پوری طرح مصطفےٰ کمال کے قابو میں رہتے تھے اگر اتفاق سے کوئی نائب اس کے حکم سے سرتابی کرتا ہوا پایا جاتا تھا تو وہ فوراً علٰحدہ کردیا جاتا تھا اور اس طرح وہ اپنی عزت و خوشحالی کو کھو دیتا تھا۔

الغرض اسوقت جمعیت ملیہ کی حالت اُس فوج کی سی تھی جس نے سارے ملک پر قبضہ کر رکھا ہو اور مصطفےٰ کمال اس فوج کا قاید اعظم تھا۔

مصطفےٰ کمال نظم و نسق کے جزئیات میں خود دخل دینا پسند نہیں کرتا تھا بلکہ تین شخص اس نے منتخب کردئے تھے اور انھیں کے ذریعہ سے وہ مشین کے تمام پرزوں کو حرکت دیتا تھا۔ ان میں سے ایک یہودی ضیا صفت تھا جو نہایت ذہین شخص تھا اور جمعیت ملیہ کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے کام کرتا تھا، یہ دن بھر کے تمام اہم معاملات و واقعات سے اس کو باخبر رکھنے کا ذمہ دار تھا۔ دوسرا شخص فوضی تھا جو فوج کے نظم و نسق کا ذمہ دار تھا اور تیسرا عصمت پاشا جو اسمبلی اور تمام دفاتر حکومت کا انچارج تھا اور خود مصطفےٰ کمال کی حیثیت بیک وقت صدر جمہوریہ، صدر اسمبلی، صدر جمعیت ملیہ، وزیر اعظم اور سپہ سالار کی تھی۔

مصطفےٰ کمال چونکہ نہایت معمولی درجہ سے ترقی کرکے اس رتبہ تک پہونچا تھا اور اس کا تمام عروج صرف اس کی محاربانہ استقامت کا ممنون تھا اس لئے صدر جمہوریہ ہونے کے بعد بھی اس نے تلوار ہی سے کام لینا چاہا، اور اپنی تاتارانہ خصوصیت کو ہاتھ سے نہیں دیا۔

اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی قوم اور اپنے ملک کو حد درجہ مہذب و شائستہ، اور بالکل جدید اصول پر ترقی کرتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا، لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ جب تک قوم کے احساس میں بیداری نہ پیدا کی جائے، اس کی تکمیل دشوار ہے اور چونکہ ترکی صدیوں سے نکبت و ذلت کی زندگی بسر کرتا آرہا تھا اس لئے وہ سمجھتا تھا کہ یوں آسانی سے ممکن نہیں اور اسی لئے اس نے اس باب میں بھی ایک جابر معلم کی سی حیثیت اختیار کی۔

اس نے یہ سوچا کہ جب تک ترکی کے ماضی سے اس کے حال کو بالکل علیحدہ نہ کر دیا جائے لوگوں کے احساس میں کوئی انقلاب پیدا ہونا ممکن نہیں۔ وہ خلافت اور سلطان کا خاتمہ کرکے اور سلطنت کو جمہوریت میں تبدیل کرکے ملک کی سیاست کو بدل ہی چکا تھا اسلئے اب اس نے لوگوں کی ذہنیت میں بھی تبدیلی پیدا کرنا چاہی اور سب سے پہلے سر کے لباس کی طرف توجہ کی۔

اس نے سب سے پہلے بطور تجربہ کے اپنے باڈی گارڈ کے سپاہیوں کو چھجہ دار ٹوپی استعمال کرائی اور جب اس طرف سے کوئی اعتراض نہ ہوا تو تمام فوج میں اس کو رائج کیا اور سمجھایا کہ بارش اور دھوپ میں یہ ٹوپی بہت کار آمد ہے۔ جب تمام فوج نے بغیر کسی احتجاج کے خوشی سے اس کو قبول کر لیا تو اس نے اہل ملک کی طرف توجہ کی اور سب سے پہلے بحر اسود کے ساحلی مقامات کا دورہ کرکے معلوم کرنا چاہا کہ ملک کس حد تک اس کے لئے تیار ہے۔ چنانچہ اس نے کستامنی کے مقامات پر ایک عام جلسہ کیا اور انگریزی ٹوپی پہن کر اس میں شریک ہوا۔ بعض لوگ دل ہی دل میں ہنس رہے تھے، بعض برہمی سے نعرہ بنا رہے تھے، لیکن مصطفےٰ کمال جسمانی و ذہنی دونوں حیثیتوں سے جری واقع ہوا تھا اس لئے اس نے پرواہ نہیں کی کہ لوگ اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں اور لوگوں کو سمجھایا کہ اگر ہم مہذب قوم بننا چاہتے ہیں تو ہم کو بین الاقوامی لباس بھی اختیار کرنا چاہئے جو شائستہ ممالک میں رائج ہے، لیکن اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی بعض نے اگر اس ٹوپی کو اختیار بھی کیا تو چند دن بعد لوگوں کے طعن و تشنیع سے تنگ آکر پھر اسے ترک کر دیا۔

اگر مصطفےٰ کمال کے بجائے کوئی دوسرا شخص ہوتا تو وہ خاموش ہو کر بیٹھ جاتا اور آہستہ آہستہ پروپاگنڈا کرکے ملک کو اس طرف مائل کرتا، لیکن چونکہ گزشتہ تجربات نے اس پر ثابت کر دیا کہ جبر و قوت سے ہر کامیابی ممکن ہے، اس لئے اس نے فوراً اسمبلی کا اجلاس کرکے وہاں سے قانون پاس کرایا کہ ترکی ٹوپی کا استعمال قانوناً جرم ہے اور دو دن کے اندر ایک ایک ٹوپی پولیس کے قبضہ میں آگئی۔

اس سے ملک کے اندر ایک ہیجان پیدا ہو گیا اور بعض مقامات میں (مثلاً سیواس، ارض روم، مراش) تو نوبت یہاں تک پہونچی کہ لوگوں نے پتھروں کی بارش شروع کر دی کیونکہ ملاؤں کی جماعت ان کو بھڑکا رہی تھی کہ فرنگی ٹوپی پہننا حرام ہے اور اس کے استعمال سے مسلمان کافر ہو جاتا ہے۔ اسمبلی میں جنرل نور الدین پاشا نے بھی اس کے خلاف احتجاج کیا۔ یہ حالات دیکھنے کے بعد مصطفےٰ کمال کا تاتاری غیظ و غضب بھڑک اٹھا اور اس نے سیکڑوں ترکوں کو دار و رسن کی سختی میں مبتلا کرکے آخر کار چند دن میں وہی بات سارے ملک سے منوالی جس کے لئے کسی دوسرے کو شاید ایک قرن کی ضرورت ہوتی۔

اب حالت یہ تھی کہ ایک طرف تو ترکی ٹوپی کا نام لینا جرم تھا اور دوسری طرف یہ مصیبت تھی کہ انگریزی ٹوپی اتنی تعداد میں فراہم نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ یہ لباس صرف عیسائیوں کا تھا اور ان میں سے اکثر خارج البلد کر دئے گئے تھے، اس لئے لوگ معمولی سینک کی ٹوپیاں بنوا کر انھیں میں کپڑے کا چھجا سا بنوا لیتے تھے اور جس کسی کو کوئی ٹوپی اس قسم کی ملجاتی تھی تو اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھا جاتا تھا۔ آرمینیا کا ایک باشندہ تھا جو صرف زنانہ ٹوپیاں فروخت کرتا تھا، یہ اپنی دوکان بند کر کے باہر چلا گیا، لوگوں نے اسکی دوکان توڑ کر ٹوپیاں نکال لیں اور وہی قیمتی اور پرلگی ہوئی زنانہ ٹوپیاں پہنکر اطمینان کی سانس لی۔ الغرض اب ملک بھر میں کسی جگہ ترکی ٹوپی کا وجود باقی نہ رہا اور ہر شخص کے سر پر خواہ وہ کسی طبقہ یا جماعت کا ہو انگریزی ٹوپی نظر آنے لگی اور اس حقیقت کو ساری اسلامی دُنیا پر واضح کرنے کے لئے مصطفےٰ کمال نے جب مسلم کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے اپنے نمایندہ ادیب ثروت کو مکہ روانہ کیا تو اس کی پوشاک اور ٹوپی دونوں مغربی وضع کی تھیں۔

جب مصطفےٰ کمال اس طرف سے مطمئن ہوا تو اس نے مذہب کی طرف توجہ کی، کیونکہ اسلام اس وقت تک حکومت کا مذہب چلا آرہا تھا اور اسے یقین تھا کہ تمام خرابیاں مذہب ہی کے بُرے استعمال کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ لوگوں سے کہتا کہ یہ مسجدوں میں جاجاکر نمازیں پڑھنے والے یا تو بیوقوف ہیں یا بدمعاش اور ملک کو ان دونوں میں سے کسی کی ضرورت نہیں — الغرض رفتہ رفتہ مذہب کے خلاف نکتہ چینیاں کرنا فیشن میں داخل ہو گیا اور مذہبی اقتدار بڑی حد تک محو ہو گیا۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑا کام اس کے سامنے یہ تھا کہ درویشوں کی جماعتوں اور اُن کی خانقاہوں کو مٹایا جائے جن کے لئے بڑی بڑی جایدادیں وقف تھیں چنانچہ اسنے جرأت کر کے اسمبلی میں ایک قانون پاس کرایا اور تمام خانقاہوں کو توڑ کر درویشوں کو وہاں سے نکلوا دیا اور تمام جایدادیں ضبط کر لیں۔

یہاں تک تو اس نے جو کچھ کیا وہ زیادہ تر تخریبی حیثیت رکھتا تھا، لیکن اب اس نے تعمیری پروگرام پر بھی عمل کرنا شروع کیا اور ماہرین مغرب کو بلا کر تجارتی قوانین جرمن اصول پر، تعزیری قوانین اطالوی اُصول پر اور مالی قوانین سوئٹزرلینڈ کے قانون کے مطابق جاری کئے۔ ان اصلاحات نے ملک کو بالکل نئے رنگ میں رنگ دیا۔ وراثت و ترکہ کے اُصول بدل گئے، ایک سے زاید شادی کرنا ممنوع قرار پایا اور عورتوں کو پورے حقوق آزادی مل گئے۔ اس سلسلہ میں جو اور ہزاروں تبدیلیاں پیدا کی گئیں ان کا احصار دشوار ہے، مثلاً وہاں عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں کے لئے علحدہ علحدہ دن (اتوار، سنیچر، جمعہ) مقرر تھے، اس نے سب کے لئے ایک دن (جمعہ) تعطیل کا مقرر کیا۔ لوگوں سے ملنے، ان سے رخصت ہونے اور گفتگو کرنے کے طریقے بھی بدل دئے۔ لفظ سلام منھ سے نکالنا قانوناً ممنوع قرار دیا اور اس کے بجائے صرف ٹوپی کو اُٹھانے کی ہدایت کی گئی، بجائے معانقہ کے صرف ہاتھ ملانا رائج کیا گیا۔ پہلے گھنٹوں کا شمار صبح سے ہوتا تھا لیکن اس نے آدھی رات سے اس کی ابتدا کی، گداگروں سے ملک کو یک لخت صاف کر دیا اور پاگلوں اپاہجوں یا معذوروں کو دیکھ کر ہنسنا جرم قرار دیا، شادی کے لئے یہ ضروری قرار دیا کہ مرد عورت دونوں ڈاکٹری سارٹیفکٹ پیش کریں، الغرض یہ اور اسی قسم کی بہت سی اصلاحیں اس نے جاری کیں اور سب مقبول ہوئیں۔

ان تحریکوں میں سب سے زیادہ اہم تحریک یہ تھی کہ ملک کی ہر چیز خالص ملکی رنگ میں نظر آئے، اور اجنبی عناصر زندگی کے تمام شعبوں سے علحدہ کر دئے جائیں، چنانچہ اس سلسلہ میں زبان کا مسئلہ اُٹھایا گیا اور عربی فارسی کے تمام الفاظ ترکی زبان سے

خارج کرکے خالص تاتاری الفاظ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر استعمال کئے گئے، قرآن اور انجیل کے ترجمے اسی زبان میں کئے گئے، نماز وخطبہ میں بھی ملکی زبان استعمال کی گئی۔ غیر ملکی مدارس کو بھی پابند کیا گیا کہ ابتدائی تعلیم ہر جگہ ترکی زبان میں دی جائے، مذہبی تعلیم بند کردی جائے اور ترکی زبان سکھانے کے لئے ترک اساتذہ متعین کئے جائیں۔ اسی طرح تجارت و کاروبار کے سلسلہ میں یہ احکام نافذ کئے گئے کہ سرمایہ و اسٹاف میں ترکوں کا عنصر غالب رہنا چاہئے اور تمام حساب و کتاب اور مراسلت ترکی زبان میں ہونی چاہئے۔ اسی کے ساتھ باقاعدہ انتظام اس کا بھی کیا گیا کہ لوگ ترکی ہی کا بنا ہوا مال خریدیں اور غیر ملکی مصنوعات کا بائکاٹ کردیں۔ بعض پیشے مثلاً ڈاکٹری اور قانون پیشگی ترکوں کے لئے مخصوص کردئے گئے اور غیر ملکی مصنوعات پر بھاری بھاری ٹیکس لگا کر ان کی درآمد کو کم کیا گیا۔

ان تمام تحریکات میں صرف ایک تحریک (یعنی بجائے عربی رسم خط کے لاطینی حروف کا استعمال) ایسی تھی جس سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ مصطفےٰ کمال نے بالکل جذبۂ وطنیت کے خلاف کام کیا، لیکن اس کی حقیقت یہ ہے کہ مصطفےٰ کمال عربی رسم الخط اور لاطینی دونوں کو اجنبی سمجھتا ہے اور اس لئے جب ان دونوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا سوال اس کے سامنے آیا تو اس نے لاطینی کو ترجیح دی، کیونکہ یہ رسم خط بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے ذریعہ سے وہ کافی پروپاگنڈا کرسکتا ہے، علاوہ اس کے وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ جب تک عربی رسم الخط قایم رہیگا، مذہب کا خیال لوگوں کے دلوں سے پوری طرح نہ نکلے گا اور نہ تعلیم عام ہوگی۔

مصطفےٰ کمال عرصہ سے اس بات پر غور کررہا تھا کہ ملک میں تعلیم کو کیونکر زیادہ وسیع کیا جائے۔ اور آخر کار وہ اس نتیجہ پر پہونچا کہ جب تک قدیم شاہراہ سے ہٹ کر کوئی جدید راہ نہ پیدا کی جائے، اہلِ ملک کو جھنجھوڑنا ممکن نہیں، ترکوں میں اسوقت تعلیمی نقدان کا یہ حال تھا کہ دس فیصدی بھی تعلیم یافتہ نہ تھے اور عربی رسم الخط کی پیچیدگی نے اس کو صرف مولویوں اور انشا پردازوں کی حد تک محدود کردیا تھا، علاوہ اسکے خود زبان میں اتنا اشکال پیدا ہوگیا تھا کہ اہل مغرب مشکل ہی سے اس کی طرف توجہ کرسکتے تھے۔ اس سے قبل ۱۹۲۶ء میں سوویٹ جمہور وسط ایشیا کے تمام تاتاریوں کے لئے لاطینی حروف کا رواج دے ہی چکی تھی، اس لئے مصطفےٰ کمال کا خیال بھی اس طرف منتقل ہوا اور اس لئے اس نے نہایت خاموشی سے پروفیسروں کو بلاکر کہا کہ ترکی زبان کی ضروریات کے لحاظ سے لاطینی حروف ہجا طیار کئے جائیں اور جب یہ کام تکمیل کو پہونچ گیا اور خود بھی اس نے مہارت حاصل کرلی تو اس نے ارادہ ظاہر کیا کہ ۱۹۲۸ء کے ایام گرما وہ مع تمام اپنے وزراء کے قسطنطنیہ میں بسر کرے گا۔

مصطفےٰ کمال ۱۹۱۹ء سے وہاں نہیں گیا تھا اس لئے یہ معلوم ہوتے ہی قسطنطنیہ میں خاصی چہل پہل پیدا ہوگئی اور پبلک میں نہایت جوش و خروش کے ساتھ اس کے استقبال کی طیاریاں شروع ہوگئیں۔

تمام شہر جھنڈیوں سے آراستہ تھا، سڑکوں کے دونوں طرف شائقین کا ہجوم خوش آمدید کے نعرے لگا رہا تھا اور توپیں شاہی سلامی سر کررہی تھیں کہ مصطفےٰ کمال قسطنطنیہ میں داخل ہوا اور دولمہ باغچہ میں جو صدیوں تک سلاطین عثمانیہ کی قیامگاہ رہ چکا تھا، اس نے قیام کیا۔

اس نے ہر طبقہ و جماعت کے سربرآوردہ لوگوں کو دعوت دی، پروفیسر، ادیب، صحافی، عمال حکومت، تاجر، سبھی موجود تھے

اور پلیٹ فارم پر مصطفےٰ کمال معہ اپنے وزراء کے بیٹھا ہوا تھا۔ پلیٹ فارم کے ایک طرف ایک سیاہ تختہ رکھا ہوا تھا اور پاس ہی چاک پنسل کا ایک بکس تھا۔

وہ اُٹھا اور لوگوں کو بتایا کہ اس نے کیوں سب کو دعوت دی ہے اور اسی کے ساتھ اس نے عربی رسم الخط کی مشکلات اور لاطینی حروف کی آسانیوں کو ظاہر کیا۔ پھر وہ سیاہ تختہ کی طرف گیا اور چاک سے جدید حروف ہجا لکھ کر حاضرین میں سے دو آدمیوں کو بلا کر کہا کہ اسی قاعدہ کے مطابق اپنے نام لکھو۔ الغرض اس نے اپنے دلایل سے، اپنی تقریر سے جس میں ہمدردی اور شاہانہ فرمان دونوں کی کیفیتیں موجود تھیں لوگوں کو یقین دلا دیا کہ ترکوں میں عام رواج تعلیم کی یہی تدبیر ہے اور سارے جلسہ نے نہایت جوش کے ساتھ اس تحریک کا خیر مقدم کیا۔

اس کے بعد مصطفےٰ کمال نے سارے ملک کا دورہ شروع کیا، وہ سیاہ تختہ اور چاک پنسل لئے ہوئے ایک ایک گاؤں میں گیا اور ہر جگہ ایک معلم کی حیثیت سے اس نے بتایا کہ جدید رسم الخط کتنا آسان ہے اور اس کے کیا فواید ہیں۔ آخر کار دفعۃً ملک کے ہر ہر گوشہ میں شوق کی لہر دوڑ گئی، اور قلی و کسان سے لیکر سوداگروں اور خانقاہوں کے مولویوں و واعظوں تک سلیٹ و پنسل لئے ہوئے جدید حروف ہجا سیکھنے میں مصروف ہو گئے۔

اس کے بعد وہ فنون لطیفہ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے خود اپنے مجسّمے طیار کرائے اور انگورہ میں ایک مدرسہ مجسمہ سازی کا قایم کیا۔ اسی کے ساتھ اس نے مغربی موسیقی کو رواج دینے کی کوشش کی اور رقص پر لوگوں کو مجبور کیا۔ اس نے عورتوں کے بے نقاب رہنے اور احتفالات رقص میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ اُن کو نظارت بلدیہ میں رائے زنی کا حق دیا اور جمعیت ملیہ کا ممبر بنا کر مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کا ولولہ ان میں پیدا کیا، اس نے اُن کو ڈاکٹری اور قانون سیکھنے کی طرف مایل کیا، دو عورتوں کو انگورہ میں جج کی خدمات تفویض کیں اور چار عورتیں استنبول میں میونسپلٹی کی ممبر بنائی گئیں۔

مصطفےٰ کمال نے اپنی بہن مقبولہ اور اپنی منھ بولی بیٹی آفتؔ کی مدد سے عورتوں کی معاشرتی اصلاح کے لئے متعدد مدارس جاری کئے اور بچوں کے لئے ایک خاص قانون نافذ کیا جس کی رو سے وہ شراب خانوں، قہوہ خانوں اور رقاصخانوں میں نہیں جا سکتے تھے ـــ اس نے سال میں ایک ہفتہ ایسا مقرر کیا جس میں انتظام سلطنت بچوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور صدارت و وزارت کی خدمات سب وہی انجام دیتے ہیں۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ ملک کے بچوں میں سیاسیات کا ذوق پیدا ہو اور وہ جوان ہو کر حکومت کا انتظام سنبھالنے کے قابل ہوں۔

مصطفےٰ کمال اس میں شک نہیں کہ وطن کا شیدا ہے اور اپنے آپ کو خدمت ملک و قوم کے لئے وقف کر چکا ہے، لیکن اپنی فطرت کے لحاظ سے وہ مسلسل کام کرنے کا اہل نہیں۔ ہفتوں گزر جاتے ہیں کہ وہ فرط انہماک سے اپنے اوپر خواب و خور حرام کر لیتا ہے اور پھر جب یہ دورہ ختم ہوتا ہے، تو ہفتوں باہر نہیں نکلتا، ہر وقت لطف و مسرت میں مستغرق رہتا ہے اور اسے کچھ خبر نہیں ہوتی کہ

ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ اس لئے ہمیشہ وہ اس بات پر مجبور رہا کہ ایک شخص دست راست کی حیثیت سے اس کے پاس ضرور رہے اور شروع سے لیکر اسوقت تک یہ خدمت عصمت پاشا نے انجام دی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ عصمت پاشا اپنی اہمیت کو محسوس کرکے بعض معاملات میں مصطفےٰ کمال کی بھی مخالفت کرنے لگا اور اسی کے ساتھ دوسرے وزرا کو بھی اسکی خودسری و خودرائی کی طرف سے شکایتیں پیدا ہوئیں۔

۱۹۳۰ء کے موسم گرما میں فتحی نے جو پیرس میں سفارت کے خدمات انجام دے رہا تھا، مصطفےٰ کمال کو لکھا کہ عصمت کی وجہ سے ترکی تباہ ہوا جا رہا ہے۔ مصطفےٰ کمال اسوقت یلووا کے مقام پر تعطیل منا رہا تھا۔ شام کے وقت جلسۂ رقص ختم ہونے کے بعد اس نے عصمت، فتحی اور اپنے دیگر احباب کو روک لیا اور گفتگو شروع ہوئی۔

دوران گفتگو میں جسوقت مصطفےٰ کمال نے ان شکایتوں کا ذکر کیا جو اس کی سماعت میں آئی تھیں تو عصمت پاشا نے کہا کہ یہ جگہ سیاسیات پر گفتگو کی نہیں۔ میں اس کا جواب اسمبلی میں دوں گا۔ اس وقت تو مصطفےٰ کمال خون کا سا گھونٹ پیکر رہگیا، لیکن اسنے فیصلہ کرلیا کہ اب اسمبلی میں صرف ایک ہی جماعت کا برسر اقتدار رہنا کوئی معنی نہیں رکھتا اور ضرورت ہے کہ کوئی مقابل جماعت پیدا کرکے لوگوں کو نکتہ چینی کا موقعہ بھی دیا جائے۔ چنانچہ اس نے ایک لبرل جماعت پیدا کرکے فتحی کو اس کا لیڈر بنایا۔

اس نے عصمت و فتحی دونوں کو بلا کر سمجھایا کہ اسمبلی کے اندر معاملات حکومت میں وہ ایک دوسرے کے خلاف اپنی پوری قوت استدلال صرف کرسکتے ہیں، لیکن اسمبلی سے باہر وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور سیاسی اختلاف کا اثر انکے ذاتی تعلقات پر نہ پڑنا چاہیئے۔

آخرکار سمرنا میں اسمبلی کا اجلاس ہوا اور مصطفےٰ کمال نے فتحی کو تمام ممکن آسانیاں عصمت کے مقابلہ کے لئے بہم پہونچائیں لیکن ملک کے لئے یہ بالکل نئی چیز تھی اور لوگوں کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہ آتی تھی کہ وزرا یا اسمبلی میں باہم مخالفت کیسی۔ اس لئے پبلک کا ہیجان بہت بڑھ گیا اور پولیس کی مدد سے اس کو روکنا پڑا۔

اس کے بعد دوسرا اجلاس انگورہ میں ہوا اور یہاں، لبرل جماعت نے کھلم کھلا موجودہ نظام پر نکتہ چینی شروع کی۔ فتحی نے کہا کہ مسلسل ۶ سال سے جمعیت ملیہ برسر اقتدار رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقتصادی و مالی حالت ملک کی بالکل تباہ ہوچکی ہے، سڑکوں، باغوں اور ریل پر بلا ضرورت کثیر روپیہ صرف کیا گیا، برآمد تقریباً بند ہوگئی، اور ملک کا سکہ بازاروں سے مفقود ہوگیا۔ ہم کو اس وقت سرمایہ کی ضرورت ہے لیکن کوئی سرمایہ دار طیار نہیں ہوتا کیونکہ ہماری ساکھ باقی نہیں رہی اور اس کا سبب صرف وہ پالیسی ہے جو اجنبی ممالک والوں کے خلاف عصمت نے اختیار کی ہے۔

عصمت نے بھی اس کا جواب اسی گرمی کے ساتھ دیا اور چونکہ جمعیت ملیہ پر اس وقت تک کسی نے تنقید نہ کی تھی اس لئے لوگوں کے مزاج برہم ہوگئے اور اسمبلی سے باہر دونوں جماعتوں کے طرفداروں میں کشت و خون کی نوبت پہونچ گئی۔

گزشتہ دس سال سے حکومت نے تقریر و تحریر کی آزادی کو سلب کر رکھا تھا اس لئے اب جو آزادی نصیب ہوئی تو ملک کی یہ

حالت ہوئی جیسے کھولتے ہوئے دیگ کا مُنھ کھول دیا گیا ہو۔ پہلے تو ڈرتے ڈرتے اخباروں نے ایک آدھ مضامین لکھے، دو چار آدمیوں نے تقریریں کیں اور جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ پولیس نے کوئی مزاحمت نہیں کی تو پھر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ جدھر سے دیکھئے اعتراضوں کی بوچھار ہو رہی ہے اور جس طبقہ کو دیکھئے لبریز شکایت ہے۔

تاجروں و دوکانداروں کا یہ رونا تھا کہ نہ ملک میں روپیہ ہے، نہ اُس کی کوئی ساکھ، اور ٹیکس ناقابل برداشت۔ کاشتکاروں کو شکایت تھی کہ مسلسل تین سال سے خشک سالی ہو رہی ہے، لیکن حسب وعدہ نہ ان کو تقاوی کا روپیہ دیا گیا اور نہ ذرائع آبپاشی پیدا کئے گئے، پبلک کو عمال سے یہ گلہ تھا کہ وہ رشوتیں لیتے ہیں اور انصاف ملک سے مفقود ہو گیا ہے، عورتوں کی طرف سے یہ غوغا بلند ہوا کہ سامان خورد و نوش بہت گراں ہو گیا ہے اور زندگی دشوار ہو گئی ہے، الغرض رفتہ رفتہ موجودہ حکومت کے خلاف ہیجان بڑھتا ہی رہا، یہاں تک کہ سارے ملک میں ایک آگ سی لگ گئی اور اس موقعہ سے درویشوں اور ملاؤں نے فایدہ اُٹھا کر کہیں کہیں بلوے بھی کرادئے، جنوب میں آرمینی انقلاب پسندوں اور سرحد ایران پر کُردوں نے بغاوت شروع کر دی، بعض گاؤں والوں نے ٹیکس کی ادائی سے انکار کر دیا، اور اسی وقت منی مَن کے مقام سے ایک شخص شیخ محمد مہدویت کا دعوےٰ کر کے اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک خطرناک بغاوت کے آثار ملک میں پائے جانے لگے۔

مصطفےٰ کمال جو اس وقت تک ان تمام حالات کو نہایت خاموشی سے دیکھ رہا تھا چونکا اور اس نے سمجھا کہ ملک ابھی اس قسم کی حکومت کے لئے طیار نہیں ہے، اس لئے وہ اپنا آہنی عزم لیکر پھر اُٹھ کھڑا ہوا اور جس طرح اپنے ایک لفظ سے اس نے یہ ہنگامہ برپا کر دیا تھا، اسی طرح دوسرے لفظ سے اسے فرو بھی کر دیا۔ اور مارشل لا جاری کر کے سب کو شکنجہ میں کس دیا۔

اس نے کُردوں کو شکست دی کُردان کے لیڈروں کو تہ تیغ کر دیا، آرمینی انقلاب پسندوں میں سے ایک ایک کو چُن کر خارج البلد کر دیا، اشتراکیت پسندوں اور سرخ نامی کے بلوائیوں کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیا، غلطہ کے پُل پر ان لوگوں کو دار پر چڑھا دیا جنھوں نے اس کے ہلاک کرنے کی سازشیں کی تھیں، درویشوں کے معمر شیخ کو معہ اس کے ارادتمندوں کے قسطنطنیہ سے گرفتار کر کے سولی پر لٹکا دیا اور منی مَن میں ایک ہزار ترکوں کو پابزنجیر کر کے ان کے ۲۸ سرداروں کو قتل کرا دیا۔ الغرض سارا ہنگامہ فرو ہو گیا اور سارا ملک پھر اسی طرح کان دبا کر اس کے سامنے پڑ گیا جیسے سرکس کے جانور ہنٹر کی پھٹکار کے سامنے دبک کر رہ جاتے ہیں۔

جب مصطفےٰ کمال اس سے فارغ ہو گیا تو اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ خود حکومت کرے گا اور اس لئے ملک کے صحیح حالات معلوم کرنے کے لئے اس نے دورہ شروع کیا، وہ لوگوں سے ملا، حالات کا مطالعہ کیا اور فتحی و صفت کو اسمبلی سے علحدہ کر کے لبرل جماعت کو توڑ دیا۔ اسی کے ساتھ اس نے ۹۰ نئے ممبر اسمبلی کے لئے منتخب کئے، جن میں تاجروں صناعوں، مزدوروں کے نمایندے بھی شامل تھے اور سنہ ۱۹۳۲ء کی اسمبلی میں اس نے ملک کو آگاہ کر دیا کہ:۔ "ابھی ملک سیاسیات میں حصہ لینے کا اہل نہیں ہے، اس لئے اُسے صرف زراعت و تجارت کی طرف متوجہ رہنا چاہئے۔ اور فی الحال دس پندرہ سال تک اس امر کی ضرورت ہے کہ صرف میں حکمراں رہوں، دس پندرہ سال کے بعد ممکن ہے کہ میں تم لوگوں کو آزادی سے بات کرنے کی اجازت دوں"

اور حقیقت یہ ہے کہ ٹرکی باوجود جمہوری حکومت ہونے کے، ہنوز شخصی و استبدادی حکومت کہلائے جانے کی مستحق ہے۔

(نوٹ) اس مضمون کا سلسلہ اس وقت سے شروع کیا گیا تھا جب مصطفےٰ کمال قسطنطنیہ پہونچا تھا۔ اور اس کی زندگی کے ابتدائی حالات چھوڑ دیئے گئے تھے، لیکن ارادہ ہے کہ آئندہ دو اشاعتوں میں اس کو بھی پیش کر دیا جائے۔

چند امور کا لحاظ رکھئے

۱— آپ جب کوئی مضمون (نظم ہو یا نثر) روانہ فرمائیں تو رُو پُشت نہ لکھئے بلکہ ایک صفحہ سادہ چھوڑئیے، اور اسی کے ساتھ جواب یا واپسی مضمون کے لئے ٹکٹ بھی رکھدیجئے۔ تاکہ بصورت اشاعت آپ کو یہ معلوم ہو سکے کہ مضمون کب تک شایع ہو سکے گا اور بصورت عدم اشاعت اسے واپس کیا جا سکے۔ اگر اس کا لحاظ نہ رکھا گیا تو نہ دفتر جواب کا ذمہ دار ہوگا نہ مضمون کے تلف ہونے کا۔

۲— علاوہ اُن خطوط کے جو میرے مخصوص احباب کی طرف سے موصول ہوتے ہیں اور جن کا تعلق نگار سے نہیں ہے، باقی تمام خطوط کا جواب بھی اسی وقت ملسکے گا جب جواب کے لئے ٹکٹ روانہ کیا جائے۔

۳— جو حضرات اپنے مضامین صرف طلب مشورہ کے لئے روانہ فرماتے ہیں، اُن کو بھی اس کا لحاظ ضروری ہے۔

۴— بعض مقالہ نگار یہ چاہتے ہیں کہ ان کا مضمون جلد سے جلد شایع کر دیا جائے لیکن افسوس ہے کہ اس کی تعمیل ممکن نہیں یہ مسئلہ اُن کو صرف میری رائے پر چھوڑنا پڑے گا۔

۵— نگار ہر ماہ کی ۱۵ تک سب کے پاس پہونچ جاتا ہے، اور زیادہ سے زیادہ ۲۰ تک جن کی اطلاع عدم رسی رسالہ کی نسبت آجاتی ہے، اُن کو دوبارہ روانہ کر دیا جاتا ہے۔ لیکن بعض حضرات مہینوں کے بعد خبر لیتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس صورت میں دفتر دوبارہ رسالہ بھیجنے کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔

۶— رسالہ نہ پہونچنے کی شکایت اکثر و بیشتر پبلک لائبریریوں اور اسکولوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ان کی ڈاک کا انتظام درست نہیں، یہاں سے کئی بار رجسٹر کا مقابلہ کرکے ہر شخص کے نام رسالہ نہایت احتیاط سے روانہ کیا جاتا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہر خریدار پہلے مقامی ڈاکخانہ سے بازپرس کرے۔

۷— بعض حضرات خط و کتابت میں نمبر خریداری درج ہی نہیں کرتے اور بعض رجسٹرڈ نمبر ۱۱۰۴ لکھدیتے ہیں۔ حالانکہ نمبر خریداری وہ ہے جو پتہ کے کاغذ پر روشنائی سے لکھا جاتا ہے۔

ایڈیٹر

حقیقت

پہلا سین :-

آواز ــــ یہ جہنم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایک آرام دہ، خوبصورت، کمانی دار کرسی پر بیٹھا ہوا ہوں۔ بھلا ایسا آرام دوزخ میں کہاں نصیب۔ (شک کے لہجہ میں) لیکن جنت میں ایسا کہر؟ میرا تو دم گھبرا رہا ہے۔ اور یہ تنہائی ــ معاذاللہ ــ ہُو کا عالم ہے۔ ایک آدمی بھی نہیں جس سے باتیں کر دں۔

(کُہر دفعتاً غائب ہو جاتا ہے اور ایک شخص سامنے کھڑا ہوا نظر آتا ہے)

روح ــــ (خوشی سے اُچھل کر) خدا کا شکر ہے کہ تم یہاں ہو ــ میں سمجھتا ہوں کہ تم فرشتہ ہو۔

خادم ــــ جی ہاں ــ میں آپ کا خادم ہوں اور آپ کے احکام بجالانے کے لئے آپ کی خدمت میں بھیجا گیا ہوں۔

روح ــــ مجھے بڑی مسرت ہوئی ــ اچھا میاں، اگر میں تمھیں عبدل کے نام سے پکارا کروں تو تم کو برا تو نہیں معلوم ہوگا۔ دنیا میں عبدل میرا بہت ہی پیارا خادم تھا ــ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے یہاں اُس کا نعم البدل عنایت کر دیا۔ (جواب میں شخص نے سر کو جھکا دیا) ــ عجیب جگہ ہے۔ میری اُمیدوں کے بالکل خلاف ــ اچھا کیا یہ مکان میرے لئے ہے؟ ــ لیکن مکان آراستہ نہیں ہے۔

خادم ــــ آپ کی خواہش کے مطابق فوراً آراستہ ہو سکتا ہے۔

روح ــــ بغیر کچھ خرچ کئے ہوئے، جتنا قیمتی سامان میں چاہوں آجائے گا؟

خادم ــــ یقیناً جو آپ کا حکم ہوگا فوراً اس کی تعمیل کی جائے گی۔

روح ــــ میں جو چیز چاہوں؟

خادم ــــ سوائے چند مخصوص باتوں کے

روح ــــ وہ کونسی باتیں ہیں؟

خادم ــــ رنج کا گزر یہاں نہیں ہے۔ لہٰذا آپ کسی ایسی چیز کی خواہش نہیں کر سکتے جس سے خود آپ کو یا کسی اور کو رنج پہونچے اچھا اب آرائش کے متعلق حکم دیجئے۔

روح —— میں فرانسیسی معاشرت پسند کرتا ہوں۔

خادم —— بہتر ہے، آپ کو کھانا کھلانے کے بعد آپ کا مکان آپ کی خواہش کے مطابق آراستہ کر دوں گا

روح —— کھانا! —— میں تو بھول ہی گیا تھا —— میں بہت بھوکا ہوں —— جلدی لاؤ

خادم —— حضور کیا تناول فرمائیں گے ؟

روح —— یہ میں تمہارے اوپر چھوڑتا ہوں۔ جنت کا بہترین کھانا کھلاؤ۔ کیا میں یہاں سگریٹ پی سکتا ہوں ؟

خادم —— ضرور، ضرور —— یہ تو آپ کی خوشی پر منحصر ہے۔

روح —— ہاں بھائی، اس لعنت میں مدتوں سے گرفتار ہوں —— اور باوجود اپنی انتہائی کوششوں کے یہ بری عادت نہ چھوڑ سکا

خادم —— (ادب سے ملامت کرتے ہوئے) حضور کیسی باتیں کر رہے ہیں، یہ جنت ہے یہاں لعنت اور برائی کا کیا ذکر۔

روح —— ہاں میاں عبدل میں بھول گیا۔ معاف کرو۔ مجھے صرف نعمتوں کا ذکر کرنا چاہیے

خادم —— کھانا حاضر ہے حضور (دونوں جاتے ہیں)۔

دوسرا سین :-

(روح اور خادم دونوں ایک کمرہ میں داخل ہوتے ہیں۔ کمرہ فرانسیسی فیشن کے مطابق سجا ہوا ہے)

روح —— ایسا کھانا میں نے کبھی نہیں کھایا تھا اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہاں وقت بھی ضائع نہیں ہوتا۔

(سامان آرائش کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے)

ان پر کتنا خرچ ہوا ہوگا ؟

خادم —— صرف آپ کی ایک خواہش۔

روح —— ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوا ؟

خادم —— حضور یہ دنیا کی طرح خرید و فروخت کی جگہ نہیں ہے خدا کے نیک بندوں کے لئے یہ خداوندی انعامات کی بارش کی جگہ ہے

روح —— تب تو اس کے معنی ہوئے کہ جس شخص کا جو جی چاہے بغیر کسی خرچ کے حاصل کر سکتا ہے

خادم —— اگر آپ روپیہ چاہتے ہیں تو میں چشم زدن میں آپ کی خدمت میں کروروں روپیہ پیش کر سکتا ہوں۔

روح —— لیکن روپیوں کی قدر و قیمت ہی کیا، جب ان سے کوئی چیز خریدی نہیں جا سکتی ؟

خادم —— بعض لوگ جنت میں ایسے بھی آتے ہیں جو اپنے سامنے روپیہ کا ڈھیر لگا کر اسے دیکھتے رہتے ہیں۔ اسی طرح بعض ایسی عورتیں بھی آتی ہیں جن کے سامنے جڑاؤ زیوروں اور جواہرات کا ڈھیر لگانا پڑتا ہے۔

روح —— لیکن جب ان چیزوں کا کوئی مصرف نہیں تو پھر ان کی فراہمی کا کیا سوال ہے۔

خادم ـــــ حضور درست فرماتے ہیں، کیونکہ یہ شوق بھی صرف چند دن باقی رہتا ہے اور پھر خود بخود اس سے نفرت ہو جاتی ہے۔

روح ـــــ مجھے یہاں ابد تک رہنا ہے لیکن ابد ایک لامتناہی مدت ہے،

خادم ـــــ جی ہاں ہے تو یہی"

روح ـــــ لیکن اتنا طویل زمانہ بیکار بیٹھے بیٹھے تو مجھ سے نہیں کٹیگا، میں کچھ کام کرنا چاہتا ہوں۔

خادم ـــــ میں حضور کے سامنے کس قسم کا کام پیش کروں؟

روح ـــــ پہلے یہ بتاؤ کہ یہاں کام ہی کیا ہے اور میں کیا کام کر سکتا ہوں؟

خادم ـــــ یہاں کام سے مراد یہ ہے کہ آپ کے لئے آپ کی خواہش کے مطابق کسی ایسی تفریح کا سامان کروں جس سے آپ کو مسرت حاصل ہو۔

روح ـــــ (گھبرا کر ہاتھ کے اشارے سے زور دیتے ہوئے) اس کو کام ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ کام اُس سعی کا نام ہے جس کا مقصد اپنی خواہش کے مطابق کچھ حاصل کرنا ہو۔ لیکن یہاں وہ بات حاصل نہیں ہے کیونکہ میں جو کچھ چاہتا ہوں وہ بغیر کوشش کے فوراً مجاتی ہے۔ اس لئے میں کام کیونکر کر سکتا ہوں؟ اور کیا کر سکتا ہوں؟ ـــــ کس مقصد کے لئے کوشش کروں ـــــ نہ کوئی مقصد ہے ـــــ نہ کوئی کام ـــــ میں سمجھتا ہوں کہ میرے لئے سوائے اس کے کچھ نہیں یونہی بیکاری میں پڑے پڑے کڑھا کروں۔

خادم ـــــ بالکل لاجواب دلائل ہیں حضور۔ کوئی شخص جواب نہیں دے سکتا۔ ہر فیلسوف جب جنت میں بھیجا جاتا ہے تو کم و بیش دس سال تک اسی طرح گفتگو کرتا ہے

روح ـــــ (حیرت سے) اُس کے بعد وہ کیا کرتے ہیں؟

خادم ـــــ جو دوسرے لوگ کرتے ہیں ـــــ یعنی بجھے جاتے ہیں۔

روح ـــــ دوسری جنتوں میں لوگ کیا کرتے ہیں؟ کیا وہاں بھی یہی حال ہے؟

خادم ـــــ مجھے معلوم نہیں کیونکہ جب سے یہ جنت آباد ہوئی ہے مجھے دوسری جنتوں میں جانے کا موقعہ نہیں ملا۔

روح ـــــ لیکن کیا اس سے قبل تم دوسری جنتوں میں بھی رہ چکے ہو؟

خادم ـــــ ہاں آج سے چالیس ہزار برس قبل ـــــ میرا خیال ہے کہ جسوقت شروع شروع آپ یہاں داخل ہوئے ہوں گے، تو گھبرا گئے ہوں گے۔

روح ـــــ ہاں۔ چند لمحوں تک تو میں بہت گھبرایا لیکن جب کُہر دور ہو گیا اور تم سامنے نظر آئے تو میری گھبراہٹ دور ہو گئی اور سمجھ گیا کہ یہ جنت ہے ـــــ میں سمجھتا ہوں کہ میری مسرت کے لئے جو جو چیزیں تم مجھے دے چکے ہو اُس کے علاوہ اب یہاں اور کچھ نہیں ہے۔

خادم ــــــ کیا چند نئی نئی کتابیں حاضر کروں؟

روح ــــــ کتابوں سے میں تنگ آگیا ہوں۔

خادم ــــــ کیا دُنیا میں آپ کو سائنس سے ذوق تھا؟

روح ــــــ کیوں؟

خادم ــــــ جنت میں ایک پروفیسر صاحب تشریف لائے تھے۔ میں اُن کی خدمت میں دیا گیا تھا۔ جب کچھ دنوں بعد آپ کی طرح وہ بھی گھبرانے لگے تو میں نے عہدِ عتیق کے ایک جانور کی ہڈی اُن کی خدمت میں پیش کی۔ یقین مانئے کہ خوشی کے مارے وہ ناچنے لگے۔ اس کے بعد میں نے چند پتھر کے ٹکڑے، اور ایک انوکھا آلہ اُن کے حوالہ کر دیا۔ بس وہ چالیس سال اسی میں لگے رہے۔

روح ــــــ اُس کے بعد اُنھوں نے کیا کیا؟

خادم ــــــ چلے گئے۔

روح ــــــ نہیں! اِن چیزوں سے مجھے کوئی خوشی حاصل نہیں ہو سکتی۔

خادم ــــــ اچھا حضور تو میں آپ کے سامنے ایک خورد بین پیش کرتا ہوں جو دنیا میں سنہ ۲۲۴۰ء میں ایجاد ہونے والی ہے اس خورد بین کے ذریعہ آپ دنیا والوں کے حالات بیٹھے بیٹھے معلوم کر سکیں گے۔

روح ــــــ (اُچھل کر) ہاں! ہاں!! ضرور لاؤ۔

تیسرا سین:۔

روح ــــــ عبدل! عبدل!! عبدل!!!

خادم ــــــ حاضر ہوا، حضور (خادم سامنے نمودار ہوتا ہے)

روح ــــــ میں اب بہت تنگ آگیا ہوں۔ میں یہاں اب ہرگز نہیں رہ سکتا۔

خادم ــــــ (منھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے) حضور ایسا نہ فرمائیے۔ یہ جنت ہے۔ یہاں سے آپ نہیں جا سکتے۔

روح ــــــ (بگڑ کر) واہ! اچھی زبردستی ہے۔ میں جنت میں نہیں رہنا چاہتا۔ میں دوزخ میں جانا چاہتا ہوں۔

خادم ــــــ (طعن آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) اور حضور! میں کہاں؟

روح ــــــ (حیرت سے) اچھا تو تمہارا بھی یہی حال ہے (دونوں ہمدردی کے جوش میں ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں)

شبلی ابراہیمی۔ ام۔ اے

مسئلۂ خلافت و امامت

(ایک غیر مسلم کے نقطۂ نظر سے)

"محترم مدیر نگار"

میں ایک عرصہ سے نگار کا مطالعہ کر رہا ہوں اور اس میں کلام نہیں کہ مذہب کے باب میں آپ کی بے لاگ تنقیدوں سے میں نے کافی استفادہ کیا، لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک آپ نے اسی مسئلہ پر توجہ نہیں کی جو یقیناً جماعت اسلامی کے ہر فرد کی اولین توجہ چاہتا ہے۔

مجھے شیعہ، سُنی کسی جماعت سے تعلق نہیں ہے، کیونکہ میں ایک غیر مسلم شخص ہوں، لیکن میں نے ہمیشہ جماعت اسلامی کے ان دونوں فریقوں کے اختلاف کو نہایت افسوس کے ساتھ دیکھا ہے اور حیران ہوں کہ اس وقت تک کیوں اس تفریق کے مٹانے کی کوشش نہیں کی گئی۔

ممکن ہے آپ نے مسئلۂ خلافت و امامت پر صرف اس لئے اظہار خیال نہ کیا ہو کہ یہ نزاع عرصہ سے چلی آ رہی ہو اور اس کا فیصلہ دشوار ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ ماضی کا عقدۂ لاینحل، مستقبل و حال میں بھی بدستور معمہ بنا رہے، بہرحال میں عرصہ سے متمنی تھا کہ آپ کے خیالات اس باب میں معلوم کروں اور اس کی تدبیر میں نے یہی مناسب سمجھی کہ خود اپنی تحقیق اس مسئلہ میں آپ کے سامنے پیش کروں اور اگر آپ کو اس سے اختلاف یا اتفاق ہو تو "باب المراسلۃ والمناظرہ" کے وساطت سے جو غالباً اسی غرض کے ساتھ نگار میں قایم کیا گیا ہے آپ مجھے جواب دے سکیں۔

آپ دیکھیں گے کہ میں نے اس مقالہ کی طیاری میں تاریخ اسلامی کے اصل ماخذوں کو سامنے رکھا ہے اور اس لئے مجھے اُمید ہے کہ جواب دینے میں آپ بھی اس کا التزام رکھیں گے۔

"برنام"

فلسفہ کے کیسے کیسے عمیق مسائل طے ہو گئے، ریاضی کے کیسے کیسے دقیق نظرئے حل ہو گئے، نظام بطلیموسی کی جگہ نظام فیثاغورس

نے لیلی، نیوٹن کے نظریۂ کشش کو انیشٹین نے بدل کر رکھدیا، لیکن خلافت کا جھگڑا مسلمانوں میں، ساڑھے تیرہ سو برس گزرنے کے بعد بھی اسی طرح اُلجھا ہوا پڑا ہے۔

"خلافت" عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "جانشینی یا قائم مقامی" کے ہیں۔ لیکن "جانشینی" کا مفہوم صرف جگہ پر بیٹھ جانا نہیں ہے، بلکہ "جانشینی" بہ حیثیت عہدہ، بہ حیثیت منصب، بہ حیثیت فرائض، بہ حیثیت اخلاق و اعمال، اور بہ حیثیت مراتب و کمال ہوا کرتی ہے۔ ایک شاعر کا جانشین شاعر، طبیب کا جانشین طبیب، قاضی کا جانشین قاضی اور وکیل کا جانشین وکیل ہوا کرتا ہے۔ ایک شاعر کی جگہ حکیم اور حکیم کی جگہ قاضی اور قاضی کی جگہ وکیل سے پُر نہیں ہوسکتی، بلکہ ایک ہی نوع میں صنف کے بدلنے سے بھی خصوصیت مختلف ہوجاتی ہے، یعنی خود شعرا میں مرثیہ گو کا جانشین غزلگو اور غزلگو کا جانشین قصیدہ گو نہیں سمجھا جاسکتا چہ جائیکہ شاعر کی جگہ لوہار اور قاضی کی جگہ معمار صحیح جانشین سمجھا جائے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ "خلیفہ" حقیقتاً وہ ہے جو اپنے کمالات و خصوصیات میں اپنے پیشرو کے کمالات و خصوصیات کا زیادہ سے زیادہ شریک و حصہ دار ہو۔

اس نظریہ کے ماتحت ہمارے سامنے قدرتاً یہ تنقیح پیش ہوتی ہے کہ آنحضرت کی حیثیت ایک دُنیاوی بادشاہ کی سی تھی یا ایک معلم روحانی کی ـــ یعنی آپ کا مقصود صرف حکومت و سلطنت قایم کرنا تھا یا لوگوں کے اخلاق کو درست کرنا ـــ ظاہر ہے کہ آپ کسی سلطنت کی بنیاد نہیں رکھ رہے تھے بلکہ ایک قوم بنا رہے تھے جو انسانیت و اخلاق کے جوہر سے آراستہ ہو اور بجائے تیغ و خنجر کے اپنی شرافتِ نفس سے روحانی حکومت دنیا میں قایم کرے۔

اگر آپ کی حیثیت صرف ایک دنیاوی بادشاہ کی سی ہوتی تو بیشک آپ کی خلافت کے لئے ایک بادشاہ ہونے کی حیثیت کافی تھی اور جو کوئی آپ کا خلیفہ مقرر کردیا جاتا کسی کو اعتراض کا حق حاصل نہ تھا، لیکن اگر رسول کی حیثیت صرف ایک بادشاہ کی سی نہ تھی بلکہ معلم روحانی ہونے کی خصوصیت بھی آپ میں پائی جاتی تھی تو ہم کو دیکھنا چاہئے کہ اس باب میں افضلیت کس کو حاصل تھی۔

اب آیئے واقعات تاریخی پر ایک نگاہ ڈالکر دیکھیں کہ اُن کا فیصلہ اس مسئلہ میں کیا ہے۔

سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ اسلام قبول کرنے کی حیثیت سے کس کو کس پر تفوق حاصل ہے ـــ ظاہر ہے کہ منصبِ نبوت ملنے کے بعد آنحضرت نے اول اول اپنے ہی گھر والوں سے تبلیغ کی ابتدا کی ہوگی جن میں جناب خدیجہ اور علی کے سوا اور کوئی نہ تھا ـــ اور ـــ اگر اہل سنت کی مستند کتابوں پر اعتماد کیا جائے تو یہ فیصلہ دشوار نہیں کہ سب سے پہلے جس انسانی ہستی نے قبول کیا وہ جناب امیر کی ذات تھی ـــ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عقلانی، تقریب التہذیب[1] میں لکھتے ہیں کہ:-

اُمِرَ بِحَجٍّ اَنَّہٗ اَوَّلُ مَنْ اَسْلَمَ

یعنی ترجیح اسی امر کو ہے کہ سب سے پہلے آپ اسلام لائے ـــ اسی کتاب کے باب الالقاب[2] سے پتہ چلتا ہے کہ آپکا سابق الاسلام

[1] مطبوعہ دہلی صفحہ ۹۴ - [2] تقریب التہذیب صفحہ ۲۳۱

ہونا اتنا مشہور تھا کہ آپ کا خطاب ہی "سابق العرب" (اہل عرب میں سب سے پہلے اسلام لانے والا) قرار پاگیا تھا۔
واقعات سے بھی اس قول کی ترجیح ظاہر ہوتی ہے۔ عفیف کندی کی روایت ملاحظہ ہو:-

"میں تاجر تھا، حج کے لئے مکہ آیا تو عباس ابن عبدالمطلب کی ملاقات کو جایا کرتا تھا، ایک دن اُنکے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ میں نے دیکھا ایک شخص پردہ سے نکلا اور پھر عبادت میں مصروف ہوگیا۔ اس کے بعد ایک خاتون پردہ سے باہر آئیں اور اس شخص کے پیچھے کھڑی ہوگئیں، میں نے عباس سے پوچھا یہ کون ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ محمد ابن عبداللہ ہیں۔ میں نے پوچھا وہ خاتون کون ہیں، کہا اُن کی بیوی خدیجہ بنت خویلد۔ تھوڑی دیر میں ایک کمسن نوعمر صاحبزادہ آیا اور وہ بھی ان کے ساتھ مصروف عبادت ہوگیا۔ میں نے پوچھا یہ کون ہیں؟ عباس نے کہا کہ یہ محمد کا چچازاد بھائی علی ہے۔ میں نے کہا یہ کرتے کیا ہیں۔ جواب ملا کہ نماز پڑھتے ہیں۔ محمد کا خیال ہے کہ خدا نے اُن کو پیغمبر بنایا ہے اور اس وقت تک سوائے اُن کی بیوی اور چچازاد بھائی کے کسی نے اُن کے اس دعویٰ کو تسلیم نہیں کیا، اس کے باوجود محمد کا خیال ہے کہ وہ قیصر و کسریٰ کے ممالک کو فتح کریں گے"

عفیف اس واقعہ کے بعد اسلام لائے تھے اور کہا کرتے تھے کہ "لو کان رزقنی الاسلام یومئذٍ کنت ثانیاً مع علی ابن ابی طالب (یعنی اگر اُس دن مجھے اسلام لانے کی توفیق ہوجاتی تو علی کے بعد دوسرا میں ہوتا)

اس روایت کو علامۂ ابن عبدالبر قرطبی نے استیعاب[1] میں، ابن اثیر جزری نے اسد الغابہ[2] میں، ابن جریر طبری نے تاریخ کبیر[3] میں اور ابن اثیر[4] نے کامل میں درج کیا ہے۔

یہ اُس وقت کی بات ہے جب آنحضرت مخفی طور پر تبلیغ اسلام کر رہے تھے، لیکن جب آیت "وانذر عشیرتک الاقربین" نازل ہوئی اور ایک محدود دائرہ کے اندر تبلیغ کا حکم نازل ہوا تو آنحضرت نے اپنے اقرباء اور اولاد عبدالمطلب و ہاشم کو جمع کیا اور اُسوقت جو تقریر آپ نے کی وہ خلافت کے مسئلہ کو بھی ہمیشہ کے لئے حل کر گئی۔

ارشاد ہوتا ہے:-

یا بنی عبدالمطلب انی واللہ ما اعلم شابا فی العرب جاء قومہ بافضل مما قد جئتکم۔ انی قد جئتکم بخیر الدنیا والاخرۃ وقد امرنی اللہ تعالیٰ ان ادعوکم الیہ فایکم یوازرنی علی ھذا الامر علیٰ ان یکون اخی، ووصیی وخلیفتی فیکم

اے فرزندانِ عبدالمطلب یاد رکھو کہ میں نہیں سمجھتا عرب کے کسی جوان نے اپنے قوم کے سامنے وہ تحفہ پیش کیا ہو جو میں تمھارے سامنے پیش کرتا ہوں۔ میں دُنیا اور آخرۃ کی بہتری کا تحفہ پیش کرتا ہوں اور خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمکو اس کی دعوت دوں۔ پھر کون ہے جو اس امر میں میرا ساتھ دے تاکہ وہی میرا بھائی، میرا ولی عہد اور میرا جانشین قرار پائے

[1] مطبوعۂ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن جلد ۲ صفحہ ۲۲۵۔ [2] مطبوعۂ مصر جلد ۳ صفحہ ۴۱۴ [3] مطبوعۂ مصر جلد ۲ صفحہ ۲۱۲۔ [4] جلد ۲، صفحہ ۲۰

یہ سنکر مجمع پر خموشی کا عالم طاری ہوگیا اور کسی طرف سے کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔ آخر کار علی اُٹھے اور بہ آوازِ بلند کہا کہ "انا یا نبی اللہ اکون وزیرک علیہ" (اے رسول اللہ میں آپ کی اعانت وہمدردی کے لئے آمادہ ہوں)۔ حضرت نے یہ سنکر فرمایا "ان ھذا اخی ووصیی وخلیفتی فیکم فاسمعوا لہ و اطیعوہ" (دیکھو یہی میرا بھائی میرا ولی عہد اور میرا جانشین ہے، تم سب کو اس کی بات سننا اور اسکی اطاعت کرنا چاہئیے)[1]

چلئے معاہدہ ہوگیا، قرار داد پایۂ تکمیل کو پہونچ گئی، علی نے بیعت کی، رسول نے بیعت لی۔ کس بات پر؟۔ نصرتِ اسلام پر۔ اعلاءِ کلمۃ الحق پر اور رسول نے اسی وقت اپنی خلافت وجانشینی کا مسئلہ بھی طے کر دیا۔

بیشک اگر خود علی اس کے بعد اپنے فرائض میں کوتاہی کرتے، اپنے اقرارِ وفا میں ثابت قدم نہ ٹھہرتے، اپنے عہد نصرت میں کمزور ثابت ہوتے، تو یہ معاہدہ بھی کالعدم ہوجاتا، لیکن چونکہ آپ کی خدمات شروع سے اخیر تک یکساں طور پر اسی طرح قائم رہتی ہیں، اس لئے ہم کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ وہ معاہدہ منسوخ ہوگیا۔ اب آئیے اس کی تحقیق بھی کرلیں کہ آپ نے کسی وقت کوئی کمزوری تو نہیں دکھائی، اعانتِ رسول سے کبھی منھ تو نہیں پھیرا اور جو قول وقرار ایک بار ہوچکا تھا اُس سے کبھی انحراف تو نہیں کیا۔

یہ امر تاریخ اسلام کے دیکھنے والوں سے مخفی نہیں کہ جب رسول اللہ نے تبلیغ شروع کی تو کفار کی ایذا رسانیاں بڑھنے لگیں، آپ کے قتل کی تدبیریں ہونے لگیں اور مسلمانوں کی جماعت ہجرت پر آمادہ ہوگئی۔ چنانچہ حد یہ ہے کہ قبایل عرب میں سے چند لوگ اس بات پر تُل گئے کہ گھر کا محاصرہ کرکے آپ کو قتل کر ڈالیں۔ ظاہر ہے کہ یہ وقت کتنا نازک تھا اور ایسے وقت میں مدد دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔ لیکن رسول اللہ جانتے تھے کہ کون کام آنے والا ہے اس لئے آپ نے بلا تامل مکہ سے پوشیدہ طور پر ہجرت کا ارادہ کرلیا اور کفار کے عزائم کو ناکام بنانے کے لئے آپ نے جناب امیر سے یہ خیال ظاہر کرکے کہا کہ

"نم علیٰ فراشی واتشح ببردی الحضرمی الاخضر فنم فیہ"

(تم میرے بچھونے پر سو رہو اور میری سبز چادر اوڑھ کر لیٹ جاؤ)

کتنا سخت مرحلہ تھا، کیسی دشوار گزار منزل تھی، مگر وہ جو ایک بار جاں نثاری ووفاداری کا عہد وپیمان کرچکا تھا، اپنی جان دینے کے لئے چادر تان کر سو رہا اور رسالتمآب تشریف لے گئے۔

قسطلانی کہتا ہے:۔

"فکان اول من شرے نفسہ" (وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے اپنی جان بیچ ڈالی)[2]

امام غزالی[3] لکھتے ہیں کہ اس موقعہ کے لئے علی کے باب میں یہ آیت نازل ہوئی:۔

"ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ" (ایسے بھی لوگ ہیں جو خدا کی مرضی پر اپنی جان بیچ ڈالتے ہیں)

---

[1] تاریخ کبیر طبری جلد ۲ صفحہ ۲۱۷۔ ابوالفداء مطبوعہ مصر جلد ۱ صفحہ ۱۱۶۔ کامل ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۲۲۔ لباب التاویل خازن بغدادی مطبوعہ مصر جلد ۵ صفحہ ۱۰۶۔ معالم التنزیل برحاشیہ تفسیر خازن مطبوعہ مصر جلد ۵ صفحہ ۱۰۵۔ [2] مواہب لدنیہ جلد ۱ صفحہ ۷۶۔ [3] تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۳۲۷۔

اکثر مورخین نے ظاہر کیا ہے کہ رسالتمآب اپنے بعد علی کو اس لئے چھوڑ گئے تھے کہ وہ لوگوں کی امانتیں جو رسول اللہ کے پاس تھیں واپس کر دیں[1]۔

آنحضرت کی معیت میں حضرت ابوبکر تشریف لے گئے اور غار میں پناہ لی، جب کفار قریش تعاقب میں یہاں تک پہونچ گئے تو حضرت ابوبکر کو فکر دامنگیر ہوئی، آنحضرت نے فرمایا، رنج نہ کرو، خدا ہمارے ساتھ ہے۔ قرآن کی آیت یہ ہے:۔

ثانی اثنین اذ ھما فی الغار یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا، فانزل السکینۃ علی رسولہٗ	وہ وقت جب ہمارا رسول اپنے ایک ساتھی کے ساتھ تھا اور وہ دونوں غار میں تھے۔ وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا غم نہ کر خدا ہمارے ساتھ ہے۔ تو خدا نے اطمینان و سکون نازل کیا اپنے رسول پر۔

اس واقعہ پر حضرت ابوبکر کے فضایل بیان کئے جاتے ہیں کہ خدا نے انھیں "صاحب" کے لفظ سے یاد کیا اور آنحضرت نے (ان اللہ معنا) کہکر اپنے ساتھ ان کو بھی شامل کر لیا۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک شخص کو محض لفظ "صاحب" یا ساتھی سے یاد کرنا، بلکہ وہ واقعی ساتھ ہو، کس فضیلت کو ثابت کرتا ہے۔ لفظ (صاحب) تو ایسا ہے جس میں ہر شخص شامل ہو سکتا ہے، چنانچہ قرآن میں دوسری جگہ کسی مومن و غیر مومن کی گفتگو کے سلسلہ میں لفظ (صاحب) اسی طرح نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

اذ قال لہ صاحبہ وھو یحاورہ اکفرت بالذی خلقک الغرض ایک ساتھی کو ساتھی کہنا کوئی ایسی بات نہیں جس سے کوئی فضیلت ظاہر ہو۔ رہا خدا کا ساتھ ہونا، سو ظاہر ہے کہ جس جگہ رسول ہوں گے، وہاں خدا کی معیت بھی ہوگی۔

غار والی آیت میں سب سے زیادہ قابل غور آخری الفاظ ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے صرف اپنے نبی پر اطمینان و سکون نازل کیا۔ یہاں اُن کے ساتھی کا ذکر بالکل نہیں ہے۔ اگر جناب ابوبکر کے اطمینان و سکون کو بھی ظاہر کرنا مقصود ہوتا تو (علی رسولہ) کے بجائے (علیہما) ارشاد ہوتا۔

بہرحال اس واقعۂ ہجرت و واقعۂ غار میں، حضرت علی نے جس ایثار و قربانی، جس دلیری و بے نفسی کا ثبوت دیا وہ بجائے خود اتنا اہم ہے کہ حضرت ابوبکر کی معیت وغیرہ کا کوئی سوال اس کے مقابلہ میں لایا ہی نہیں جا سکتا۔ اب اور آگے چلئے۔

مدینہ میں آنے کے بعد آنحضرت نے مہاجرین و انصار کے درمیان دوبارہ مواخاۃ قائم کی۔ ظاہر ہے کہ بھائی چارا انھیں دو آدمیوں میں قائم کیا جاتا ہے، جو اپنی خصوصیات مزاجی و عادات و خصایل کے لحاظ سے باہم گر بہت ملتے جلتے ہوں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت ابوبکر کو حضرت عمر کے ساتھ بھائی بھائی قرار دیا، حضرت حمزہ کو زید ابن حارثہ کے ساتھ، حضرت عثمان کو عبدالرحمن ابن عوف کے ساتھ، زبیر کو ابن مسعود کے ساتھ، عبیدہ ابن حارث کو بلال کے ساتھ، مصعب ابن عمیر کو سعد ابن ابی وقاص کے ساتھ، ابوعبیدہ جراح کو سالم مولی ابی حذیفہ

---

[1] ابوالفداء جلد ۱ صفحہ ۱۲۶ ۔۔۔ تاریخ خمیس دیار بکری جلد ۱ صفحہ ۲۶۶ ۔۔۔ کامل ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۳۹ ۔۔ مواہب لدنیہ قسطلانی مطبوعہ قسطنطنیہ جلد ۱ صفحہ ۸۰ ۔

کے ساتھ اور سعید ابن زید کو طلحہ کے ساتھ ۔ رہ گئے علی سو اُن کا بھائی چارا اپنے ساتھ کیا، چنانچہ مورخ ابو الفدا لکھتا ہے[1] :-

اخی رسول اللہ فاتخذ رسول اللہ علی ابن ابی طالب اخا و کان علی یقول علی منبر الکوفۃ ایام خلافتہ انا عبد اللہ و اخو رسول اللہ

آنحضرت نے اپنے اصحاب میں مواخات قرار دی اور علی ابن ابی طالب کو اپنا بھائی قرار دیا اور علی اپنے زمانۂ خلافت میں کوفہ کے منبر پر کہا کرتے تھے کہ میں خدا کا بندہ اور رسول خدا کا بھائی ہوں ۔

ایک دوسرے موقعہ پر بھی رسول اللہ نے سب کو ایک دوسرے کے ساتھ بھائی بنایا تھا اور علی کو اپنے ساتھ رکھا تھا ۔ ابن عبد البر نے استیعاب[2] میں لکھا ہے :-

اخی رسول اللہ بین المھاجرین ثم اخی بین المھاجرین و الانصار و قال فی کل واحد منھما لعلی انت اخی فی الدنیا و الاخرۃ

رسول اللہ نے ایک بار مہاجرین کے درمیان مواخاۃ قائم کی اور دوسری بار مہاجرین و انصار کے درمیان اور ہر مرتبہ یہی فرمایا کہ علی دُنیا و آخرت میں میرا بھائی ہے ۔

اس کا تذکرہ ابن حجر مکی کی صواعق[3] محرقہ اور تاریخ خمیس[4] میں بھی موجود ہے ۔

مسجد نبوی کی صورت یہ تھی کہ اس کے چاروں طرف صحابہ کے گھر تھے اور ان سب کے دروازہ مسجد میں کھلتے تھے، جس سے لوگوں کی آمد و رفت صحن مسجد میں رہتی تھی ۔ ایک مرتبہ آنحضرت نے حکم دیا کہ سب دروازے چُن دئے جائیں مگر علی کے مکان کا دروازہ نہ چنا جائے اس حکم پر لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں تو حضرت نے منبر پر جا کر فرمایا کہ " مجھے جو حکم خدا کی طرف سے ہوا وہ میں نے کیا، میں نے اپنی مرضی سے نہ اُن دروازوں کو بند کیا، نہ اس کو کھلا رکھا[5] ۔

اس واقعہ سے اور اس قسم کے بہت سے نظائر سے جن کا ذکر آگے آئے گا، معلوم ہوتا ہے کہ لوگ رسول کی ان توجہات کو جو جناب علی کے ساتھ تھیں، اچھی نگاہوں سے نہ دیکھتے تھے اور جناب رسالتمآب کی موجودگی میں بھی نکتہ چینی سے باز نہ آتے تھے، اور یہ وہ جذبات تھے جن کا آہستہ آہستہ قوی ہونا ضروری تھا کیونکہ رسول اللہ کے الطاف جناب امیر پر برابر بڑھتے ہی جاتے تھے اور جیسا کہ آیندہ صفحات سے معلوم ہوگا حضرت علی اپنی خصوصیات اخلاق کی وجہ سے رسول اللہ کے دل میں گھر کرتے ہی جارہے تھے ۔

۲ھ میں اسلام کی سب سے پہلی لڑائی ہوئی جس کا نام جنگ بدر ہے، مسلمانوں کی تعداد کم تھی، ساز و سامان بھی موجود نہ تھا اور رسول اللہ کے لئے میدان جنگ سے کچھ علحدہ ایک عرش بنا دیا گیا تھا تاکہ وہاں سے جنگ کی حالت کا مشاہدہ فرماتے رہیں ۔

---

[1] تاریخ ابو الفدا جلد ۱ صفحہ ۱۲۷ ۔ [2] مطبوعۂ دائرۃ المعارف حیدر آباد جلد ۲ صفحہ ۴۷۳ ۔ [3] مطبوعۂ مصر صفحہ ۷۵ ۔ [4] جلد ۱ صفحہ ۱۹۶ ۔
[5] خصائص نسائی صفحہ ۱۳ ۔ ریاض نضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۹۲ ۔

حضرت ابوبکر نے اس لڑائی میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا بلکہ وہیں عریش پر بیٹھے رہے[1]۔ حضرت عثمان اپنی بیوی کی علالت کی وجہ سے مدینہ ہی میں رہ گئے تھے[2]۔ میدان جنگ اُس دن چند آدمیوں کے ہاتھ رہا جن میں نمایاں حصہ رسول اللہ کے قرابتداروں نے لیا۔ مثلاً حضرت حمزہ ابن عبدالمطلب، عبیدہ بن حارث اور حضرت علی۔ عبیدہ شہید ہو گئے اور حضرت علی کے ہاتھ سے بڑے بڑے کفار قتل ہوئے[3]۔

اسی سال حضرت نے علی ابن ابی طالب کو اپنی دامادی سے سرفراز کیا اور اپنی محبوب صاحبزادی حضرت فاطمہ زہرا کا عقد اُن سے کر دیا۔ تاریخوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر دونوں نے خواستگاری کی مگر رسول اللہ نے کوئی جواب نہ دیا[4]۔ لیکن جب حضرت علی نے خواہش ظاہر کی تو حضرت نے فرمایا کہ:۔

قد امرنی ربی بذالک (اس کا تو مجھے خدا نے حکم دیا ہے)

جب عقد ہو چکا تو حضرت نے جناب فاطمہ سے فرمایا:۔

اما ترضین یا فاطمۃ ان اللہ اختار من اھل الارض رجلین جعل احدھما اباک والاخر بعلک[5]	اے فاطمہ کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ خدا نے تمام اہل زمین میں دو شخصوں کا انتخاب کیا جن میں سے ایک تمہارا باپ ہے اور دوسرا شوہر۔

اس سے ظاہر ہے کہ اس شادی کی بنیاد صرف ذاتی قرابت پر نہیں تھی بلکہ انتخاب الٰہی اور فضیلت ذاتی پر تھی۔ مصالح اسلامی کے لحاظ سے لڑکیاں لے لینا اور خود داماد بن جانا دوسری بات تھی، لیکن جب لڑکی دینے کا وقت آیا تو بڑے بڑے صحابہ کی خواہش رد کر دی گئی اور حضرت علی کا انتخاب کیا گیا۔ یہ واقعہ ایسا نہ تھا جس کا اثر زائل ہو جاتا، یاد رہا اور عمر بھر رہا، چنانچہ حضرت عمر فرماتے تھے۔

لقد اعطی علی ثلث خصال لان تکون لی خصلۃ منھا احب الی من حمر النعم فسئل ماھی قال تزویجہ ابنتہ[6]	علی کو تین باتیں ایسی حاصل ہوئیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی مجھے حاصل ہوتی تو سرخ اونٹوں سے زیادہ مجھے محبوب ہوتیں۔ پوچھا گیا وہ کیا ہیں۔ کہا کہ ایک تو یہی کہ رسول کی صاحبزادی کا عقد اُن سے ہوا۔

سنہ ۳ھ میں اُحد کی جنگ ہوئی، یہ وہ سخت و فیصلہ کن جنگ تھی جسے قدرت کو مسلمانوں کے عزم و ثبات کی کسوٹی بنانا منظور تھا۔ اول اول حالات بہت اُمید افزا تھے، کیونکہ لشکر کفار کے علمدار طلحہ بن عثمان کو حضرت علی نے قتل کر کے دشمنوں کو شکست دیدی تھی لیکن

---

[1] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۰۔ ابوالفدا جلد ۱ صفحہ ۱۲۸۔ تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۴۲۷۔ طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۹۔ [2] طبری جلد ۳ صفحہ ۲۹۶۔ ابوالفدا جلد ۱ صفحہ ۱۲۹۔ تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۴۱۸۔ طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۶۔ [3] تاریخ ابوالفدا جلد ۱ صفحہ ۱۲۹۔ [4] صواعق محرقہ مطبوعہ مصر صفحہ ۸۶ تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۴۰۶۔ مواہب اللدنیہ جلد ۱ صفحہ ۸۹۔ [5] ریاض نضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۸۲۔ [6] صواعق محرقہ صفحہ ۷۸۔ تاریخ الخلفا سیوطی صفحہ ۱۰۱۔

جب کفار بھاگ کھڑے ہوئے اور مسلمان مال غنیمت لوٹنے کے لئے پس وپیش سے بے خبر ہو گئے تو خالد ابن ولید نے (جو اس وقت تک اسلام نہ لائے تھے) پشت کی طرف سے پھر حملہ کر دیا اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا اُسے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی زبان سے سن لیجئے، مدارج النبوۃ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"مسلمانان روبہ ہزیمت آوردند و حضرت رسول را تنہا گزاشتند، حضرت در غضب آمد و عرق از پیشانی ہمایونش متقاطر گشت، دراں حالت نظر کرد علی ابن ابی طالب را کہ بر پہلوئے مبارکش ایستادہ است فرمود کہ تو چرا بہ برادران خود ملحق نگشتی یعنی فرار نہ کردی. علی گفت اکفر بعد الایمان ان لی بک اسوۃ یعنی آیا کافر شوم بعد از ایمان۔۔ بتحقیق کہ مرا بتو اقتدا است بایاران مفرور چہ سروکار باشد۔ دریں اثنا جمعے از کفار متوجہ آنحضرت شدند۔ آنحضرت فرمود "اے علی، مرا ازیں جمع نگہدار، و حق خدمت بجا آر کہ وقتِ نصرت ست۔ پس علی متوجہ آں قوم شد۔ چناں تیغ قمع نمود کہ جمعے کثیر بدوزخ افتادند و باقی ماندگان متفرق گشتند۔ می گویند کہ دراں روز شانزدہ زخمہا بر تنِ مبارکِ جناب امیر رسیدہ"

دل بھر آتا ہے، قلم لرزتا ہے۔ جی چاہتا ہے مورخوں کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں، تاریخ کے صفحات سے ان حروف کو چھیل کر پھینک دوں۔ کس طرح دیکھوں اور کیونکر لکھوں کہ کس کس نے فرار کیا۔۔ لیکن حاکم کو کیا کروں، امام فخرالدین رازی، محمد ابن جریر طبری، ابن اثیر جزری، شیخ الاسلام سیوطی، ان سب کے بیانات کو کہاں لے جاؤں، جدھر دیکھئے اُس طرف سے "روبہ ہزیمت آوردند رسول اللہ را تنہا گزاشتند" کی آواز آرہی ہے اور لطف یہ کہ ایک ایک کا نام بھی لکھ رہا ہے۔

تاریخ خمیس (جلد اصفحہ ۴۸۵) میں ہے کہ حضرت ابوبکر فرماتے ہیں:۔

لما صرف الناس یوم احد عن رسول اللہ کنت اول من جاء النبی

یعنی (جب لوگوں نے اُحد کے دن رسول اللہ سے روگردانی کی تو میں رسالتمآب کے پاس سب سے پہلے واپس آیا)

تفسیر جامع البیان ابن جریر طبری (جلد ۴ صفحہ ۹۶) میں لکھا ہے:۔

قال عمر لما کان یوم احد ھزمنا ففررت حتی صعدت الجبل فلقد رأیتنی انزو کانی اروی"

یعنی حضرت عمر نے فرمایا کہ "جب اُحد کے دن لوگوں نے شکست کھائی تو میں بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گیا وغیرہ وغیرہ"

امام فخرالدین رازی تفسیر کبیر (جلد ۳ صفحہ ۴۷) میں لکھتے ہیں:۔

ومن المنھزمین عمر الا انہ لم یکن فی اوائل المنھزمین ولم یبعد بل ثبت علی الجبل الی ان صعد النبی ومنھم ایضا عثمان انھزم مع رجلین یقال لھما سعد وعقبۃ انھزموا حتی بلغوا موضعا بعیدا ثم رجعوا بعد ثلثۃ ایام فقال لھم النبی لقد ذھبتم فیھا عریضۃ

(فراریوں میں حضرت عمر بھی تھے مگر وہ سب سے پہلے فرار کرنے والوں میں نہ تھے اور بہت دور بھی نہ گئے تھے بلکہ پہاڑ پر چلے

گئے تھے۔ فراریوں میں سے حضرت عثمان بھی تھے اور سعد و عقبہ کے ساتھ فرار کیا تھا اور یہ لوگ بہت دور نکل گئے تھے اور جب تین دن کے بعد واپس آئے تو رسول اللہ نے فرمایا کہ تم لوگ بہت لمبے نکل گئے تھے)

حضرت عثمان مقام اعوص کے حدود تک پہونچ گئے تھے اور جب وہاں سے تین دن کے بعد واپس آئے تو رسول اللہ نے وہ فقرہ فرمایا جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔[1]

خود قرآن مجید میں جو تصویر اس جنگ کی پیش کی گئی ہے وہ بھی ملاحظہ ہو۔ ارشاد ہوتا ہے،

اذ تصعدون ولا تلوون علی احد والرسول یدعوکم فی اخراکم | وہ وقت جب تم پہاڑ پر چڑھے چلے جا رہے تھے اور مڑ کے بھی کسی کو نہ دیکھتے تھے اور رسول تمھیں پیچھے سے آواز دے رہا تھا۔

یہ تھا وہ عبرت انگیز سماں اور یہ تھا وہ امتحان محبت و صداقت جس میں سوائے ایک ذات علی کے اور کوئی دوسرا کامیاب ثابت نہ ہوا۔ رسول اللہ کو اس دشکن طرز عمل کی وجہ سے اتنی بے اطمینانی پیدا ہو گئی تھی کہ آپ نے خاتمۂ جنگ پر قتل ہو جانے والوں کے متعلق فرمایا:۔ ھؤلاء اشھد علیھم "یہ وہ ہیں جن کے ایمان کی گواہی میں دیتا ہوں"۔ حضرت ابوبکر نے کہا "یا رسول اللہ کیا ہم انکے بھائی نہیں ہیں اور کیا ہم اسلام نہیں لائے اور کیا ہم نے کبھی آپ کے ساتھ جہاد نہیں کیا"، حضرت نے فرمایا:۔ بلی ولا ادری ما تحدثون بعدی" (ہاں، مگر کیا معلوم میرے بعد تم لوگ کیا کروگے)[4]

۵ھ میں جنگ خندق واقع ہوئی۔ اُحد کے واقعہ کا دھبا دامنوں پر موجود تھا اور اس کے چھڑانے کا یہ موقع اچھا تھا، لیکن عمر ابن عبدود کا سا بہادر پورے جوش و خروش سے مبارزطلبی کر رہا تھا، کس میں ہمت تھی کہ موت کے منھ میں چلا جائے۔ تاریخ کا بیان ہے کہ:۔ "طلب المبارزۃ والاصحاب ساکتون کانما علی رؤسھم الطیر لانھم کانوا یعلمون منعتہ" (اس نے مقابل طلب کیا اور اصحاب تمام خاموش تھے گویا کہ ان کے سروں پر طائر بیٹھا ہوا ہے کیونکہ وہ سب اس کی شجاعت سے آگاہ تھے) جناب امیر پہلی ہی آواز میں اُٹھ کھڑے تھے، مگر رسول اللہ نے انھیں روک دیا، لیکن جب ہر طرف خاموشی چھائی رہی اور عمر ابن عبدود کی لنترانیاں بڑھنے لگیں تو رسول اللہ نے جناب امیر ہی کو اجازت دی اور آخر کار انھیں کی تلوار نے اس مہم کو بھی سر کیا۔[5]

۶ھ میں صلح حدیبیہ واقع ہوئی۔ رسول اللہ بظاہر حج کے ارادہ سے تشریف لے گئے تھے لیکن مشرکین کے سد راہ ہونے سے آپ نے حج کا ارادہ ترک فرما دیا اور چند شرائط کے ماتحت صلح کر لینا منظور فرما لیا۔ یہ شرطیں ایسی تھیں جن سے رسول اللہ کی

---

[1] طبری جلد ۳ صفحہ ۲۱ — [2] استیعاب جلد صفحہ ۵۰۲ — [3] تفسیر جامع البیان جلد ۴ صفحہ ۹۶ — [4] موطا امام مالک مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی صفحہ ۱۷۴ — [5] تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۵۴۷

طرف ایک قسم کی کمزوری کا پہلو نمایاں تھا۔ اس صلح نامہ کے کاتب حضرت علی تھے۔ لیکن دوسرے اصحاب کو اس موقعہ پر طرح طرح کے شکوک پیدا ہو گئے اور اس رواداری پر عجیب قسم کے غصہ وغم کی لہر دوڑ گئی۔

طبری نے لکھا ہے:۔

قد کان اصحاب رسول اللہ خرجوا وھم لا یشکون فی الفتح لرؤیا رآھا رسول اللہ فلما راؤ ما راؤ من الصلح والرجوع وما تحمل علیہ رسول اللہ فی نفسہ دخل الناس من ذلک امر عظیم حتی کادوا ان یھلکوا[1]

جو صحابہ رسول اللہ کے ساتھ آئے تھے انھیں یقین تھا کہ فتح ہوگی کیونکہ رسول اللہ نے ایک خواب دیکھا تھا، لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ حضرت نے صلح کر لی ہے اور سخت شرائط منظور کر کے واپس جا رہے ہیں تو ان کے دلوں میں ایسی بُری باتیں پیدا ہوئیں کہ قریب تھا وہ ہلاکت یعنی گمراہی میں مبتلا ہو جائیں۔

حضرت عمرؓ کا جو عالم تھا وہ خود اُن کی زبان سے سُنئے:۔

اتیت النبی فقلت الست نبی اللہ قال بلی قلت السنا علی الحق وعدونا علی الباطل، قال بلی۔ قلت فلم نعطی الدنیۃ فی دیننا اذاً قال انی رسول اللہ ولست اعصیہ وھو ناصری قلت اولیس کنت تحدثنا انا سنأتی البیت نطوف بہ، قال بلی افاخبرتک انا ناتیہ العام، قلت لا قال فانک اتیہ وتطوف بہ قال فاتیت ابا بکر فقلت یا ابا بکر الیس ھذا نبی اللہ حقاً قال بلی، قلت السنا علی الحق وعدونا علی الباطل قال بلی قلت فلم نعطی الدنیۃ فی دیننا اذاً قال ایھا الرجل انہ رسول اللہ ولیس یعصی ربہ وھو ناصرہ فاستمسک بغرزہ فو اللہ انہ علی الحق قلت الیس کان یحدثنا انا سنأتی البیت ونطوف بہ قال بلی افاخبرک انک تاتیہ العام قلت لا قال فانک اتیہ فتطوف بہ[2]

میں رسول اللہ کے پاس آیا اور کہا کیا آپ رسول خدا نہیں ہیں کہا کیوں نہیں، میں نے کہا کیا ہم حق پر اور ہمارا دشمن ناحق پر نہیں ہے، فرمایا ہاں ایسا ہی ہے۔ میں نے کہا پھر ہم اس ذلت کو کیوں برداشت کریں، فرمایا میں خدا کا رسول ہوں اور خدا کے حکم کے خلاف نہیں کرتا اور وہی میرا مددگار ہے۔ میں نے کہا کیا آپ نے ہم سے نہیں کہا تھا کہ ہم عنقریب خانۂ کعبہ کی طرف جائیں گے اور اس کا طواف کریں گے۔ حضرت نے فرمایا کیوں نہیں لیکن کیا میں نے اسی سال کے لئے کہا تھا میں نے کہا کہ یہ تو نہیں کہا تھا، فرمایا پھر میں اب بھی وہی کہتا ہوں کہ میں خانۂ کعبہ آؤں گا اور یہاں کا طواف کروں گا۔ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں ابوبکر کے پاس بھی گیا اور اُن سے بھی وہی گفتگو کی جو رسول اللہ سے کی تھی۔

[1] تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۷۹۔ [2] مواہب لدنیہ قسطلانی جلد ۱ صفحہ ۱۲۱۔

طبری کی روایت میں آپ کا پہلے حضرت ابوبکر کے پاس اور پھر آنحضرت کے پاس جا کر سوال و جواب کرنا تحریر ہے۔ تاریخ خمیس (جلد ۲ صفحہ ۲۴) میں ہے کہ حضرت عمر نے کہا کہ:-

واللہ ما شککت منذ اسلمت الا یومئذ (جب سے میں اسلام لایا کبھی مجھے شک نہیں ہوا، جیسا اُس دن ہوا) یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمر فرماتے تھے "کہ میں نے اس جسارت کے کفارہ میں بہت نمازیں پڑھیں اور روزے ادا کئے"۔

الغرض صلح حدیبیہ کی وجہ سے صحابہ رسول اللہ سے اس قدر خفا ہو گئے تھے کہ جب صلح کے بعد رسول اللہ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ "قوموا، فانحروا ثم احلقوا"۔ (اُٹھو قربانیاں کرو اور سر منڈواؤ) تو ان میں سے ایک بھی آمادہ نہ ہوا، یہاں تک کہ حضرت نے تین مرتبہ فرمایا اور جب اس کے بعد بھی کسی نے تعمیل حکم نہ کی آنحضرت کبیدہ خاطر ہو کر حضرت ام سلمہ کے خیمہ میں تشریف لے گئے[۳]

جب رسول اللہ قربانی کرنے کے بعد سر منڈوا چکے تو لوگوں نے بادلِ ناخواستہ خود بھی قربانیاں شروع کیں۔ "بادلِ ناخواستہ" کا حال ابن عباس کی روایت ذیل سے معلوم ہو سکتا ہے۔

حلق رجال یوم الحدیبیة وقصر آخرون فقال رسول اللہ یرحم اللہ المحلقین، قالوا والمقصرین یا رسول اللہ قال یرحم المحلقین قالوا والمقصرین یا رسول اللہ قال یرحم المحلقین قالوا یا رسول اللہ والمقصرین قال والمقصرین قالوا یا رسول اللہ فلم ظاهرت الترحم للمحلقین دون المقصرین قال لانهم لم یشكوا

کچھ لوگوں نے حدیبیہ کے دن سر منڈوایا اور بعض نے بال ترشوائے رسول اللہ نے فرمایا سر منڈوانے والوں پر خدا رحمت کرے لوگوں نے کہا اور بال ترشوانے والوں پر، آپ نے پھر وہی کہا۔ آخر تیسری مرتبہ کہا کہ بال ترشوانے والوں پر بھی رحمت ہو، لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے اُن کو کیوں ترجیح دی، فرمایا کہ انھوں نے شک نہیں کیا تھا[۴]۔

محمد ابن سعد کاتب واقدی کی روایت ہے کہ حضرت عثمان اور ابو قتادہ نے سر نہیں منڈوایا تھا[۵]۔

۷ھ میں خیبر کی مہم درپیش ہوئی۔ اتفاق سے جناب امیر کی آنکھیں آشوب کر آئی تھیں، اور آپ مدینہ ہی میں رہ گئے تھے۔ خیبر کے قلعوں میں جو سب سے زیادہ مضبوط قلعہ تھا وہ دشمن کا مرکز تھا۔

تین روز تک متواتر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر پرچم اسلام لیکر تشریف لے گئے، لیکن ہر بار ناکام واپس آئے[۷]۔

---

[۱] تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۸۰ — [۲] تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۲۵ — [۳] تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۸۱ — [۴] تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۲۵ — [۵] طبقات ابن سعد جلد ۲ مطبوعہ لیڈن صفحہ ۷۵ — [۶] تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۵۳ — [۷] السیرۃ النبویہ عبدالملک ابن ہشام برحاشیۂ روض الانف جلد ۲ صفحہ ۲۳۹۔

تاریخ طبری میں لکھا ہے کہ "آنحضرت نے علم حضرت عمر کو دیا اور بہت سے لوگ آپ کے ساتھ گئے، لیکن خیبر والوں سے مقابلہ ہوا تو آپ کے، اور آپ کے ساتھیوں کے پاؤں اُکھڑ گئے اور رسالتمآب کے پاس واپس آئے، اس حال میں کہ ساتھ والے اُن پر بزدلی کا الزام لگاتے تھے اور آپ ساتھیوں پر"[1]

جب یہ صورت دیکھی تو رسول اللہ نے فرمایا:۔

اما واللہ لاعطینّ الرایۃ غداً رجلاً کراراً غیر فرار یحب اللہ و رسولہ و یحبہ اللہ و رسولہ یفتح اللہ علٰے یدیہ[2]	کل میں علم اس شخص کو دوں گا جو بھاگنے والا نہیں ہے جو اللہ اور رسول کو دوست رکھتا ہے اور جسے اللہ و رسول دوست رکھتے ہیں۔ خدا اسی کے ہاتھوں سے فتح کرائے گا۔

بعض روایات میں "کراراً غیر فرار" کا ٹکڑا نہیں ہے (ملاحظہ ہو صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۳۲ و طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۸) لیکن اگر اس ٹکڑے کو علٰحدہ کر دیا جاسئے تو معنی تشنہ رہتے ہیں، کیونکہ صورتِ حال یہ تھی کہ برابر تین دن سے اصحاب کی سرکردگی میں مہمیں بھیجی جاری تھیں اور برابر یہ لوگ شکست کھاکر واپس آجاتے تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ رسول اللہ نے یہی کہا ہوگا کہ کل میں اُس کو علم دوں گا جو بھاگ کر واپس نہ آئے، ورنہ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی، علاوہ اس کے اس فقرہ کو علٰحدہ کر دینے سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ "کل میں علم اس کو دوں گا جو خدا و رسول کو دوست رکھتا ہے اور جسے خدا اور رسول، دوست رکھتے ہیں" گویا وہ لوگ جو اس سے قبل پرچم اسلام لیکر خیبر فتح کرنے گئے تھے وہ خدا اور رسول کے دوست نہ تھے اور اس صورت میں صحابہ کی اور زیادہ توہین ثابت ہوتی ہے۔

بہر حال "کراراً غیر فرار" کا ٹکڑا ہو یا نہو، یہ امر مسلّم ہے کہ رسول اللہ تین دن کی مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے کسی اور شخص کا انتخاب کرنا چاہتے تھے جس کا اظہار آپ نے ان الفاظ میں فرمایا۔

اس خبر کے سُننے کے بعد صحابہ پر کیا اثر ہوا؟ اس کا حال بخاری کے الفاظ میں سنئے:۔

فبات الناس یدوکون لیلتھم ایھم یعطاہ فلما اصبح الناس غدوا کلھم یرجون ان یعطاہ	تمام رات لوگوں نے چہ میگوئیوں میں بسر کر دی اور جب صبح ہوئی تو ہر شخص یہ تمنا لئے ہوئے تھا کہ علم اسے ملیگا۔

طبقات ابن سعد کاتب واقدی میں ہے کہ "حضرت عمر کا بیان ہے کہ مجھے کبھی اس دن سے پہلے سرداری کی خواہش نہیں ہوئی تھی مگر اس دن میں اونچا ہو ہو کر دیکھ رہا تھا اور منتظر تھا کہ علم مجھ کو دیا جائے گا"[3]

طبری نے لکھا ہے کہ "جب دوسرا دن ہوا تو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر علم کے واسطے گردنیں اونچی کر کر کے دیکھنے لگے"[4] لیکن اُس دوسرے دن صبح کو کیا ہوا۔؟ حضرت نے علم کو لیکر جنبش دی، اور فرمایا کون اس کو لیتا ہے ایک صاحب آگے بڑھے اور کہا

---

[1] تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۹۳ ۔ [2] تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۵۳ ۔ خصائص نسائی صفحہ ۱۱ ۔ الریاض النضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۸۷ ۔ سیرۃ نبویہ عبدالملک روض الانف جلد ۲ صفحہ ۲۳۹ ۔ استیعاب جلد ۲ صفحہ ۴۰۳ ۔ [3] طبقات جلد ۲ صفحہ ۸۰ ۔ [4] تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۹۳ ۔

میں، آپ نے فرمایا، جاؤ جاؤ آگے بڑھو قسم اس خدا کی جس نے محمد کے چہرہ کو عزت دی ہے میں یہ علم اس شخص کو دوں گا جو بھاگنے والا نہیں ہے، اے علی، اٹھو اور علم لو"[1]

چنانچہ آپ نے علم لیا، قلعہ فتح کیا اور کامران و بامراد واپس آئے۔

سنہ ۸ھ میں مکہ معظمہ فتح ہوا اور مسلمان خوشیاں منا رہے تھے لیکن نبی اور علی دو ہستیاں ایسی تھیں جو اسلام کی خدمت سے غافل نہ تھیں۔ وہ اصنام جو خانہ کعبہ میں نصب کر دئے گئے تھے، رسالتمآب اور علی ابن ابی طالب ان بتوں کو توڑنے کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ وہ بت جو سب سے بڑا تھا اور خانہ کعبہ کے اوپر نصب تھا اس کے توڑنے کے لئے رسول اللہ نے علی کو اپنے کاندھے پر بلند کیا اور آپ نے اس کو توڑ ڈالا۔

مورخ دیار بکری نے لکھا ہے کہ اس وقت رسول اللہ نے حضرت علی سے فرمایا:۔

طوبیٰ لک تعمل للحق وطوبیٰ لی احمل للحق | (مبارک ہو تم کو کہ تم حق کے لئے کام کر رہے ہو اور خوشحال میرا کہ میں حق کیلئے تمہارا بار اٹھائے ہوئے ہوں[2])

یہ باتیں بظاہر دیکھنے میں بہت معمولی حیثیت رکھتی ہیں لیکن انھیں جزئی واقعات سے عمومی تاریخ مرتب ہوتی ہے اور ایک مورخ انھیں واقعات سے صحیح نتیجہ تک پہونچنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

اسی سال کے آخر میں حُنین کی جنگ ہوئی۔ یہ رسول اللہ کی آخری لڑائی تھی کیونکہ اس کے بعد جنگ تبوک ہوئی جس میں رسول اللہ بغیر جنگ کئے ہوئے واپس آگئے تھے۔

اس لڑائی کی کیفیت بڑی حسرت خیز و حیرت انگیز ہے اور قرآن مجید میں اس کی کیفیت حسب ذیل الفاظ میں بیان کی گئی ہے:۔

ویوم حنین اذ اعجبتکم کثرتکم فلم تغن عنکم شیئا وضاقت علیکم الارض بما رحبت ثم ولیتم مدبرین | اور حُنین کے دن کو یاد کرو جبکہ تمہاری کثرت نے تمھیں مغرور بنا دیا تھا مگر اس نے تمھیں کوئی فائدہ نہ پہونچایا اور زمین تم پر تنگ ہو گئی اور تم نے جنگ میں پیٹھ دکھا دی۔

صورت یہ ہوئی کہ دشمن کی فوج کمینگاہ میں تھی، اس نے اچانک حملہ کر دیا اور مسلمانوں کے قدم اُٹھ گئے۔ سوائے سات آٹھ آدمیوں کے کوئی باقی نہ رہا۔[3]

ان آٹھ آدمیوں کی فہرست میں اکثر کتابوں میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا نام بھی نظر آتا ہے لیکن صحیح بخاری میں ابوقتادہ کی روایت یہ ہے کہ "تمام مسلمانوں نے راہ فرار اختیار کی اور میں بھی اُن کے ساتھ بھاگا، ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ سب کے ساتھ

---

[1] الریاض النضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۸۷۔ [2] تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۹۵۔ [3] الروض الانف سہیلی جلد ۲ صفحہ ۲۹۔ مواہب لدنیہ جلد ۱ صفحہ ۱۶۳۔

حضرت عمر بھی ہیں، میں نے کہا یہ کیا ہوا۔ آپ نے فرمایا کیا بتاؤں خدا کی مرضی۔ پھر اس کے بعد رفتہ رفتہ لوگ رسالتمآب کے پاس واپس گئے۔[1]

محدث ابن ابی شیبہ کا بیان ہے کہ:۔

"آنحضرت کے ساتھ صرف چار آدمی رہ گئے تھے، تین بنی ہاشم میں سے اور ایک اور جن کی تفصیل یہ ہے۔ علی و عباس آپ کے آگے تھے، ابوسفیان لگام پکڑے ہوئے تھے اور ابن مسعود پہلو میں تھے اور کوئی شخص دشمنوں میں سے حضرت کی طرف نہ بڑھتا تھا مگر یہ کہ وہ قتل ہو جاتا تھا"[2]

ان فرار کرنے والوں پر ایک عورت ام سلیم بنت ملحان نے انتہائی غم و غصہ کا اظہار کیا، وہ رسالتمآب کے پاس سے بالکل جدا نہیں ہوئی۔ حضرت نے پکار کر فرمایا "ام سلیم" اس نے کہا۔ "جی حضور، میرے ماں باپ آپ پر نثار، آخر آپ فرار ہونے والوں کو قتل کیوں نہیں کر ڈالتے"، حضرت نے اس کے جواب میں صرف اس قدر ارشاد فرمایا کہ "یہ بھاگ جاتے ہیں، تو کیا ہوا خدا کافی ہے"[3]

استیعاب میں حضرت عباس کے حالات میں لکھا ہے کہ:۔

"حنین کے دن آنحضرت کے پاس سے سب فرار کر گئے سوا عباس، عمر، علی اور ابوسفیان کے، بعض لوگوں نے کہا ہے کہ سات آدمی حضرت ہی کے گھر کے رہ گئے تھے، ابن اسحاق نے کہا ہے کہ یہ سات آدمی علی، عباس، فضل ابن عباس، ابوسفیان، جعفر بن ابی سفیان، ربیعہ بن حارث اور اسامہ بن زید ہیں اور اسامہ بن زید ہیں اور ان کے علاوہ آٹھویں ایمن ابن عبید۔ بعض مورخوں نے ابوسفیان کے بجائے حضرت عمر کا نام لیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابوسفیان تو یقیناً حضرت کے ساتھ تھے، حضرت عمر کے متعلق بیشک اختلاف ہے"[4]

اس جنگ سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ نے طایف کا محاصرہ کیا، کیونکہ مشرکین وہاں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ اسی دوران میں ایک دن رسول اللہ نے جناب امیر کو بلا کر بڑی دیر تک راز کی گفتگو کی۔ اس پر لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور کہا:۔ لقد طال نجواہ مع ابن عمہ (آج تو رسول اللہ اپنے ابن عم سے بڑے طولانی مشورے کر رہے ہیں)۔۔ رسول اللہ نے سنا تو فرمایا۔ ما انتجیتہ ولاکن اللہ انتجاہ" (میں نے علی کو مشورہ کے لئے منتخب نہیں کیا ہے بلکہ خدا نے کیا ہے)۔ اس روایت کو حافظ ترمذی نے درج کیا ہے اور حسن صحیح قرار دیا ہے۔[5]

۹ھ میں غزوہ تبوک واقع ہوا۔ رسول اللہ کی زندگی کو صرف ایک سال باقی ہے اور یہ غزوہ آخری غزوہ ہے۔ گرمی کا زمانہ ہے

---

[1] صحیح بخاری مطبوعہ مصر جلد ۳ صفحہ ۴۳ – [2] مواہب لدنیہ جلد ا صفحہ ۱۶۳ – [3] طبری جلد ۳ صفحہ ۱۲۹ – [4] استیعاب جلد ۲ صفحہ ۴۹۸ – [5] الریاض النضرہ جلد ۲ صفحہ ۲

شدت کی لُو چل رہی ہے اور رسالتمآب نے اپنے ساتھ چلنے کے لئے تمام اصحاب کو حکم دیا ہے، لیکن حضرت علی کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ تم مدینہ میں قیام کرو اور میری جگہ رہو۔ حضرت علی کبیدہ خاطر ہو کر کہتے ہیں:۔

اتخلفنی فی الصبیان والنساء (کیا آپ مجھے بچوں اور عورتوں میں چھوڑ جائیں گے)

حضرت جواب دیتے ہیں:۔ اما ترضیٰ ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لانبی بعدی (کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم مجھ سے وہی نسبت رکھو جو ہارون کو موسیٰ سے تھی، سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی ہونے والا نہیں ہے)[1]

اگر آخری جملہ "لا نبی بعدی" کا نہ ہوتا تو ہارون کی منزلت کو صرف وقتی جانشینی اور عارضی خلافت تک محدود سمجھا جا سکتا تھا، لیکن اس جملہ سے ثابت ہوتا ہے کہ زندگی میں اور بعد وفات دونوں حالتوں میں جناب امیر کو اسی جانشینی و خلافت کا درجہ حاصل ہے جو ہارون کو موسیٰ کے بعد حاصل ہوا۔

دُنیا کو معلوم ہے کہ ہارون موسیٰ کے شریک کار، معاون اور وزیر و جانشین تھے اور اگر ان کی زندگی موسیٰ کے بعد باقی رہتی تو خلافت کا حق سوائے اُن کے کسی کو نہ پہونچتا۔ بالکل اسی طرح جناب امیر کے لئے ثابت ہوتا ہے کہ وہ حیات و ممات ہر حالت میں رسول اللہ کے جانشین تھے اور اگر ہارون سے کوئی فرق تھا تو صرف یہ کہ ہارون نبی تھے اور رسول اللہ کے بعد سلسلۂ نبوت ختم ہو گیا لیکن اگر یہ سلسلہ ختم نہ ہوتا تو نبی بھی سوائے حضرت علی کے دوسرا نہ ہوتا۔

اسی سال کا واقعہ ہے کہ سورۂ برائت کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن کا اعلان مکۂ معظمہ میں حج کے موقعہ پر ہونا تھا، اس واقعہ کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ نسائی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے حضرت ابوبکر کو ان آیات کے ساتھ روانہ کر دیا تھا، اس کے بعد ان کو واپس بلا کر یہ خدمت حضرت علی کے سپرد کی، دوسری روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُن کو واپس نہیں بلایا بلکہ خود حضرت علی کو روانہ کیا کہ حضرت ابوبکر سے وہ آیات لیکر خود اس خدمت کو انجام دیں۔ بہر حال ان تمام روایات میں رسول اللہ کا یہ قول قدر مشترک کے طور پر پایا جاتا ہے کہ۔ علی منی وانا منہ ولا یودی عنی الا انا وعلی۔ یعنی علی مجھ سے ہے اور میں علی سے اور اپنی ترجمانی یا میں خود کر سکتا ہوں یا علی۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ اس طرح پائے جاتے ہیں:۔ انی امرت ان ابلغہ انا، رجل من اھل بیتی (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ یا میں خود اس کو پہونچاؤں یا ایسا شخص جو میرے اہلبیت میں داخل ہو)[2]

بہر حال حضرت ابوبکر روانہ ہو چکے تھے یا نہیں، وہ واپس بلائے گئے یا نہیں، یہ مسلّم ہے کہ آیات قرآنی کی تبلیغ کے لئے حضرت نے جناب امیر کو منتخب کیا اور یہ کہکر کہ اس خدمت تبلیغ کا اہل میں ہوں یا پھر وہ جو میرے اہلبیت میں داخل ہو۔

---

[1] صحیح بخاری جلد ۳ صفحہ ۵۔ تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۱۲۸۔ تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۱۰۴۔ الریاض النضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۶۲۔ سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۳۱۶۔ مواہب لدنیہ جلد ۱ صفحہ ۲۰۱۔ تاریخ الخلفا سیوطی ۱۶۷ و ۱۶۸۔

[2] خصائص نسائی صفحہ ۲۲-۱۴۔ روضۃ الانف جلد ۲ صفحہ ۲۲۳۔ طبری جلد ۳ صفحہ ۱۵۴۔ تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۱۵۷۔ ریاض نضرہ صفحہ ۱۷۴

سنہ ۱۰ھ میں رسول اللہ نے جناب امیر کو یمن کی طرف تبلیغ کے لئے روانہ کیا اور اس شان سے کہ عقد لواءً وعممه بیده وارسل طرفيها من قدامه نحو ذراع ومن خلفه قيد شبر ۔۔۔ (حضرت نے ان کے لئے علم طیار کیا خود اپنے ہاتھ سے اُن کے سر پر عمامہ باندھا اور عمامہ کا ایک سرا آگے کی طرف قریب ایک ہاتھ کے سینہ پر ڈالدیا اور دوسرا سرا پشت کی طرف ایک بالشت لٹکا دیا)[۱]

اس مہم کی سرکردگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام قبیلۂ ہمدان اور اکثر اہل یمن ایک ہی دن میں آپ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور آپ مدینہ واپس لوٹے ۔۔ اس مہم پر پہلے خالد ابن ولید کی نامزدگی ہو چکی تھی اور چونکہ حضرت علی کے بھیجے جانے سے وہ معزول ہوئے اسلئے بعض حضرات کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی[۲] اور اس کا انتقام یوں لیا گیا کہ چند لوگ جناب علی کی یہ شکایت لیکر مدینہ پہونچے کہ آپ نے اموال خُمس میں سے ایک کنیز پر بغیر اجازت رسول تصرف کر لیا۔ اس کا جو جواب رسول اللہ نے دیا ہے وہ کتب احادیث میں اب تک محفوظ ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

عمران حصین کی روایت ہے کہ اقبل رسول الله والغضب يعرف فی وجهه فقال ما تريدون من علی ثلاثاً ان علياً منی وانا منه وهو ولی كل مومن بعدی (حضرت مخاطب ہوئے مگر اس طرح کہ غصہ آپ کے چہرہ سے نمایاں تھا اور کہا تم لوگ علی سے کیا چاہتے ہو، آخر کیا چاہتے ہو۔ علی مجھ سے ہے، میں علی سے ہوں اور وہ ہر مومن کا میرے بعد ولی ہے)[۳]

بریدہ کی روایت میں ہے:۔

لما اتيت النبی دفعت الكتاب فقرأه عليه فرأيت الغضب فی وجهه فقال لا تقع فی علی فانه منی وانا منه وهو وليكم بعدی (یعنی جب میں آیا اور حضرت کو خط دیا تو آپ نے پڑھنا شروع کیا اور چہرہ پر غصہ کے آثار نمایاں ہوتے جارہے تھے، آپ نے فرمایا علی کی بُرائی نہ کرو، وہ مجھ سے ہے میں اُس سے ہوں اور وہ تمھارا حاکم ہے میرے بعد)[۴]

علامہ ابن حجر مکی شرح قصیدۂ ہمزیہ[۵] میں لکھتے ہیں:۔

ما صح عنه صلی الله عليه وسلم وهو اللهم وال من والاه وعاد من عاداه ان علياً منی وانا منه وهو ولی كل مومن بعدی (صحیح اسناد سے ثابت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا خداوندا دوست رکھ اسے جو علی کو دوست رکھے اور دشمن رکھ اس کو جو علی کو دشمن رکھے اور یہ کہ علی مجھ سے ہے، میں علی سے ہوں اور وہ ولی ہے ہر مومن کا میرے بعد)

اسی سنہ ۱۰ھ کے آخر میں رسالتمآب نے آخری حج کیا ہے جو حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے، یہ جناب رسالتمآب کی زندگی کا

---

[۱] تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۱۶۰ ۔ [۲] بخاری مطبوعۂ مصر جلد صفحہ ۳۴۱ ۔ [۳] ریاض نضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۷۱ ۔ خصائص نسائی صفحہ ۲۳، ۲۵ ۔ [۴] استیعاب مطبوعہ حیدرآباد صفحہ ۴۷۰ ۔ [۵] مطبوعۂ مصر صفحہ ۲۳۷ ۔

آخری زمانہ ہے اور صرف چند ماہ آپ کی رحلت کو باقی ہیں۔

جناب امیر زکوٰۃ و خمس لینے یمن چلے گئے تھے جب رسول اللہ حج کے لئے روانہ ہوئے، لیکن آپ وہاں سے واپس آکر رسول اللہ سے مل گئے تھے۔ اس موقع پر بھی جناب امیر کی دیانت و امانت سے فوج والوں کو شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ جب آپ یمن سے واپس ہوئے اور مکۂ معظمہ کے قریب پہونچے تو آپ فوج سے علٰحدہ ہو کر پہلے پہونچ گئے اور صحابہ میں سے ایک شخص کو فوج کا سردار بنا آئے۔ اس قائم مقام سردار نے تمام اسباب و اموال میں سے جو یمن سے آیا تھا لباس فاخرہ نکلوا کر فوج کے تمام سپاہیوں کو پہنا دیا، جب فوج کا داخلہ ہونے لگا تو حضرت علی معائنہ کے لئے گئے اور یہ دیکھ کر بہت برہم ہوئے اور تمام لباس اتروا کر اموال میں پھر شامل کر دیا۔ یہ بات بھی لوگوں کو بہت ناگوار ہوئی اور رسول اللہ سے شکایت کی گئی تو آپ نے ایک عام تقریر کی اور فرمایا۔ لا تشکوا علیا فواللہ انہ لاخشن فی ذات اللہ من ان یشکی (یعنی علی کی شکایت نہ کرو، خدا کی قسم وہ اللہ کی مرضی کے لئے اتنا بے لوث ہے کہ اس کی شکایت کا موقع ہی نہیں ہے)[1]

یہ حج سے پہلے کا واقعہ ہے۔ اب وہ وقت ہے کہ رسول اللہ حج سے فارغ ہو کر مدینہ واپس تشریف لا رہے ہیں۔ حضرت چلتے چلتے غدیر خم تک پہونچتے ہیں، پورا قافلہ روک دیا جاتا ہے اور اعلان ہوتا ہے کہ رسول اللہ تقریر فرمائیں گے۔ ہزاروں آدمی خطبۂ نبوی سننے کے لئے مجتمع ہیں اور آپ منبر پر تشریف لیجا کر ایک مبسوط خطبہ کے ذریعہ سے اپنے قرب وفات کی پیشین گوئی کرتے ہیں، اپنی خدمات ہدایت کا ذکر فرماتے ہیں، لوگوں سے اصول اسلام و ایمان کی گواہی لیتے ہیں اور اس کے بعد وہ کچھ فرماتے ہیں جس سے انکار کی گنجایش نہیں اور جس نے ہمیشہ کے لئے آپ کی جانشینی کے مسئلہ کو طے فرما دیا۔

اس سلسلہ میں حافظ طبرانی کی روایت جو بہ سند صحیح منقول ہے حسب ذیل ہے:۔

ایھا الناس انی یوشک ان ادعیٰ فاجیب انی مسئول و انکم مسئولون فما ذا انتم قائلون (مسلمانو، عنقریب مجھے بلالیا جائے گا اور میں تم سے رخصت ہو جاؤں گا، میں بھی جوابدہ ہوں اور تم بھی جوابدہ ہو اس لئے بتاؤ کہ جب یہ وقت آئے گا تو تم کیا کہوگے) فقال الیس تشھدون ان لا الٰہ الا اللہ و ان محمداً عبدہ و رسولہ، و ان جنتہ حق و ان نارہ حق و ان البعث حق بعد الموت و ان الساعۃ اٰتیۃ لا ریب فیھا و ان اللہ یبعث من فی القبور قالوا بلیٰ نشھد بذلک قال اللھم اشھد۔ ثم قال یا ایھا الناس ان اللہ مولای و انا مولی المومنین و انا اولیٰ بھم من انفسھم فمن کنت مولاہ فھذا مولاہ یعنی علیا اللھم وال من والاہ و عاد من عاداہ (حضرت نے فرمایا کیا تم لوگ اس بات کی گواہی نہ دوگے کہ سوائے اللہ کے کوئی خدا نہیں اور یہ کہ محمد خدا کا بندہ اور رسول ہے اور جنت حق ہے، جہنم حق ہے اور موت حق ہے اور زندگی بعد موت کے حق ہے اور قیامت آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں اور خدا مردوں کو زندہ کریگا۔ سب نے کہا ہاں،

[1] سیرۃ ابن ہشام برحاشیۂ روض الانف جلد ۲ صفحہ ۳۵۱۔ طبری جلد ۳ صفحہ ۱۶۸۔ استیعاب مطبوعہ حیدرآباد صفحہ ۵۰۷۔ صواعق محرقہ مطبوعہ مصر صفحہ ۲۶۔

ہم اس کی گواہی دیتے ہیں حضرت نے فرمایا، خداوندا گواہ رہنا۔ پھر فرمایا اے لوگو خدا میرا مولا ہے اور میں تمام مومنین کا مولا ہوں اور اُن کے نفسوں کا خود اُن سے زیادہ حقدار ہوں۔ اس کے بعد جس کا میں مولا ہوں اُس کا یہ مولا ہے (علی کی طرف اشارہ کیا) خداوندا دوست رکھ اس کو جو علی کو دوست رکھے اور دشمن رکھ اس کو جو علی کو دشمن رکھے) ثم قال ایھا الناس انی فرطکم و انتم واردون علی الحوض، و انی اسئلکم حین تردون علی عن الثقلین فانظروني کیف تخلفوني فیھما الثقل الاکبر کتاب اللہ سبب طرفہ بید اللہ و طرفہ بایدیکم فاستمسکوا بہ لا تضلوا و لا تبدلوا و عترتی اھل بیتی فانہ قد نبانی اللطیف الخبیر انھما لن ینقضیا حتی یردا علی الحوض (پھر حضرت نے فرمایا اے لوگو، میں تمہارے آگے جاتا ہوں اور تم حوض کوثر پر میرے پاس پہونچو گے تو میں تم سے دریافت کروں گا کہ تم نے میرے بعد ثقلین کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ایک ان میں سے کتاب خدا ہے جو ایک زنجیر ہے جس کا ایک سرا خدا سے متصل اور دوسرا تمہارے پاس ہے اس کو پکڑے رہو، گمراہ نہ ہو اور ادل بدل نہ کرو، دوسرے میری عترت، میرے اہلبیت۔ خدا نے مجھے بتایا ہے کہ یہ دونوں فنا نہ ہوں گے جب تک میرے پاس حوض کوثر پر وارد نہ ہوں)

علامۂ ابن حجر مکی نے صواعق محرقہ (مطبوعۂ مصر صفحہ ۲۵-۲۶) میں اس روایت کو درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ حضرت نے تین مرتبہ صحابہ سے دریافت کیا الست اولی بکم من انفسکم (کیا میں تم پر تم سے زیادہ اختیار نہیں رکھتا)۔ سب نے کہا بیشک، بیشک، بیشک اور پھر اس کے بعد رسول اللہ نے حضرت علی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر فرمایا:-

من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم وال من والاہ و عاد من عاداہ و انصر من نصرہ و اخذل من خذلہ و ادر الحق حیث دار[1]

(یعنی جس کا میں مولیٰ ہوں علی اس کا مولیٰ ہے خداوندا دوست رکھ اس کو جو اسے دوست رکھے اور دشمن رکھ اسے جو اسے دشمن رکھے، مدد کر اس کی جو اُس کی مدد کرے، ساتھ چھوڑ اُس کا جو اس کا ساتھ چھوڑے اور حق کو اُس طرف گردش دے جس طرف وہ گردش کرے)

اس کے بعد اس روایت پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"یہ حدیث صحیح ہے، اس میں کوئی شک نہیں، اور ترمذی، نسائی، احمد بن حنبل وغیرہ ایک جماعت نے اس کی تخریج کی ہے اور اس کے طرق و اسناد بہت زیادہ ہیں۔ چنانچہ ۱۶ صحابیوں نے اسکی روایت کی ہے اور احمد بن حنبل کی ایک روایت میں ہے کہ ۳۰ صحابیوں نے اس کے سننے کی گواہی دی ہے اور اس کے اسناد اکثر صحیح و حسن ہیں"[1]

---

[1] صواعق محرقہ مطبوعۂ مصر صفحہ ۲۵-

استیعاب ابن عبدالبر- اسد الغابہ ابن اثیر جزری میں متعدد مقام پر یہ روایت مذکور ہے۔ حافظ محب طبری نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:۔

"اس واقعہ کے بعد حضرت عمر، جناب علی سے ملے اور کہا کہ مبارک ہو آپ کو کہ آپ ہو گئے ہر مومن و مومنہ کے مولا۔"

اب رسول کی زندگی صرف دو ماہ اور چند دن کی باقی رہ گئی ہے اور مسلمانوں کی شب یلدا جب ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دے گا نزدیک ہے۔ آیئے واقعات کا ذرا جائزہ لے لیں، شاید رسول اللہ کے بیانات سے کوئی شمع ہدایت، ایسی مل جائے جو تجلیات نبوی کے اوجھل ہو جانے کے بعد ہمارے لئے دلیل راہ بن سکے۔

گزشتہ صفحات کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ شروع سے اخیر تک ہر موقع پر رسول کے ساتھ مواسات و ہمدردی میں پیش پیش رہنے والا، کسی موقع پر قدم میں تزلزل نہ آنے دینے والا اور سخت سے سخت وقت میں اطاعتِ رسول سے سر مو انحراف نہ کرنے والا کون تھا؟ آپ نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ جناب امیر کی اس اطاعت و جاں نثاری کی بنا پر رسول کی بارگاہ میں جو رسوخ ان کو حاصل تھا وہ دوسرے صحابہ کو گراں گزرتا تھا اور وہ اپنے جذبات سے مجبور ہو کر شکوہ و شکایت بھی کر گزرتے تھے۔

مسجد نبوی میں صحابہ کے مکانوں کے جو دروازے کھلتے تھے اُن کے بند کر دئے جانے کا واقعہ، طائف میں رسول اور علی کی رازدارانہ گفتگو کا حال، بریدہ کا واقعہ، اور حجۃ الوداع سے قبل یمن سے واپسی کا واقعہ آپنے ملاحظہ فرمایا ہو گا، اور رسالتمآب کی طرف سے جناب امیر کے خلاف اعتراض یا شکوہ کا جو جواب ملتا تھا وہ بھی آپ نے پڑھ لیا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ نفسیات کے لحاظ سے یہ تمام واقعات اور زیادہ صحابہ کی برہمی کا باعث ہوئے ہوں گے۔ چنانچہ رسالتمآب کو احساس تھا کہ جب میری زندگی میں یہ ہو رہا ہے تو بعد میں خدا جانے کیا ہو۔ احد میں صرف اتنی سی افواہ پر کہ رسول اللہ قتل ہو گئے سب کے قدم میدان سے اُٹھ گئے اور زبانوں پر یہی تھا کہ پیغمبر نہ رہے تو اسلام کیسا اور لڑائی کیسی۔ انس بن نضر نے لوگوں سے پوچھا۔ "تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیوں بیٹھے ہو" جواب ملا کہ:۔ "رسول تو ہیں نہیں پھر ہم کیا کریں"۔ انس نے کہا۔ "رسول نہیں تو نہ سہی تم ان کے دین پر تو قائم ہو اٹھو اور جہاد کرو"، مگر بیٹھ رہنے والے بیٹھے ہی رہے اور انس نے جان دیدی۔ قرآن مجید کی جو آیتیں اس موقع سے تعلق رکھتی ہیں غور سے پڑھنے کے قابل ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

ما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افئن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم ومن ینقلب علی عقبیه فلن یضر الله شیئاً

(محمد نہیں ہیں مگر ایک رسول جن کے پہلے بہت رسول گزر چکے تو کیا وہ مر جائیں یا قتل ہو جائیں تو کیا تم اسلام سے پلٹ جاؤ گے اور جو شخص ایسا کرے گا تو خدا کو اُس سے کوئی نقصان نہیں پہونچ سکتا)

---

۱ مطبوعہ حیدرآباد جلد ۲ صفحہ ۲۷۳- ۲ جلد ۵ صفحہ ۲۰۵، جلد ۳ صفحہ ۲۷۴، ۳۰۷، ۳۲۱- ۳ ریاض نضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۶۹-

اس کے علاوہ رسالتمآب نے اپنی بے اطمینانی کا جن الفاظ میں اظہار کیا وہ بھی گوشگزار ہو چکے ہیں۔ جب آپ نے شہدائے اُحد کے متعلق فرمایا کہ میں ان کا گواہ ہوں تو حضرت ابوبکر نے کہا کیا ہم نے کبھی ان کی طرح جہاد نہیں کیا۔ یہ سنکر رسول اللہ نے فرمایا۔ "ہاں مگر کسے خبر ہے تم لوگ میرے بعد کیا کرو۔"

دوسرے موقعوں پر حضرت نے اس خطرہ کے وقوع کی صریح پیشین گوئی کی ہے۔ بخاری کی حدیث ہے کہ:۔

"آنحضرت نے فرمایا میں تم سے پہلے حوض کوثر پر پہونچونگا، کچھ لوگ تم میں سے میری طرف لائے جائیں گے اور جب میں چاہوں گا کہ انھیں اپنے قریب بلاؤں تو وہ مجھ سے جدا کر دئے جائیں گے، میں کہوں گا خداوندا یہ تو میرے اصحاب ہیں، ارشاد ہوگا تمھیں معلوم نہیں انھوں نے تمھارے بعد کیا گل کھلائے"[1]

آنحضرت کو جن چیزوں کے متعلق یہ خطرہ تھا ان کو صاف طور پر حجۃ الوداع کے خطبہ میں ظاہر فرمادیا جس کی اصل عبارت پہلے درج ہو چکی ہے) اس میں آنحضرت نے اس تمہید کے ساتھ کہ انا فرطکم علی الحوض (میں حوض کوثر پر تمھارا پیشرو ہوں) یہ فرمایا ہے کہ میں تم میں دو چیزیں بہت گرانقدر چھوڑے جاتا ہوں، ایک کتاب خدا دوسرے اپنی عترت و اہلبیت، دیکھوں میرے بعد تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو۔" اس طرح حضرت نے اس پہلی بیعت کے موقعہ پر جب "انذر عشیرتک الاقربین" کا حکم نافذ ہونے پر ملی تھی، علی کی وزارت وصایت و خلافت کا اعلان فرمادیا تھا۔ پھر اس کے بعد مختلف طرح سے علی کے کمالات کو روشن کیا، علمی حیثیت سے "انا مدینۃ العلم و علی بابہا" فرما کر یہ ثابت کیا کہ میرے علوم اگر دستیاب ہو سکتے ہیں تو صرف علی کے ذریعہ سے۔ "اقضاکم علی" کہکر فصل مقدمات کا بہترین ماہر بتایا۔ "و علی منی" کہکر انتہائی یگانگت و وابستگی کا اظہار فرمایا اور سب سے آخر میں غدیر خم کے میدان میں "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" کہکر علی کی حکومت، ولایت و خلافت کا صریح اعلان فرمادیا، یہاں تک کہ صحابہ نے علی کو مبارکباد بھی دی، لیکن کیا رسول اللہ کو اطمینان ہوگیا تھا، ہرگز نہیں، واقعات بتلاتے ہیں کہ آپ مطمئن نہ ہوئے تھے۔

حضرت اس خطبہ کے بعد غدیر خم سے روانہ ہو کر مدینہ پہونچے، محرم کے مہینہ بھر آپ اچھے رہے، صفر میں بیمار پڑے اور اُس بیماری میں مبتلا ہوئے جو آپ کے لئے مرض الموت ثابت ہوئی۔ حضرت نے اس بیماری کی حالت میں تقریر کی اور فرمایا:۔

ایھا الناس یوشک ان اقبض قبضا سریعا فینطلق بی وقد قدمت الیکم القول معذرۃ الیکم الا انی مخلف فیکم کتاب ربی و عترتی و اھل بیتی (اے لوگو بہت قریب ہے وہ وقت کہ میں دنیا سے اُٹھ جاؤں اور تم سے رخصت ہوں۔ میں نے اس سے قبل تم سے سب کچھ کہہ دیا ہے، اور حجت تمام کردی ہے۔ پس تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں تمھارے درمیان خدا کی کتاب اور اپنی عترت اہلبیت کو چھوڑے جارہا ہوں)

یہ کہکر حضرت نے جناب امیر کا ہاتھ پکڑا اور اسے بلند کر کے فرمایا:۔

ھذا علی مع القرآن والقرآن مع علی لا یفترقان حتی یردا علی الحوض فاسئلھما ما خلفت فیھما (علی قرآن کے ساتھ ہے

---

[1] بخاری جلد ۴ صفحہ ۱۳۶۔

اور قرآن علی کے ساتھ یہ دونوں جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر پہونچیں۔ میں ان سے دریافت کروں گا کہ تم نے ان سے میرے بعد کیا سلوک کیا۔[1]

اب مرض کی شدت اور زیادہ بڑھ گئی، حضرت نے اسی عالم میں ایک علم اسامہ بن زید کے لئے طیار کیا اور تمام بڑے بڑے صحابہ کو اسامہ کی ماتحتی میں جنگ کے لئے روانگی کا حکم دیا۔ تاریخیں متفق ہیں کہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر بھی اسامہ کے ساتھ جانے پر مامور ہوئے تھے۔

لوگوں کو بڑا ناگوار ہوا کہ رسالتمآب نے اتنے بڑے بڑے صحابہ پر اسامہ بن زید کو حاکم بنا دیا۔ حضرت کو معلوم ہوا تو آپ کو بہت غصہ آیا اور اسی حالت میں چادر اوڑھے، سر پر رومال باندھے باہر آگئے اور منبر پر جاکر فرمایا:-

"تم لوگ اسامہ کی امارت پر معترض ہو، یہ نئی بات نہیں ہے۔ اس سے پہلے تم اس کے باپ (زید بن حارثہ) کی امارت پر بھی اعتراض کر چکے ہو۔ بخدا وہ امارت کے لائق تھا اور یہ اس کا بیٹا بھی امارت کے لائق ہے"۔[2]

بیشک ان اشخاص میں جو ساتھ جانے پر مامور تھے حضرت علی کا نام نظر نہیں آتا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مدارج النبوۃ میں تصریح کردی ہے کہ:-

"حکم عالی چناں صادر شد کہ از اعیان مہاجر و انصار مثل ابوبکر صدیق، و عمر فاروق و عثمان ذی النورین و سعد بن ابی وقاص و ابوعبیدہ بن الجراح و غیرہم الا علی مرتضیٰ را کہ ہمراہ نہ کرد دراں لشکر ہمراہ اسامہ باشند"

واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ کو اپنی زندگی کے آخر ہونے کا یقین تھا وہ اپنی موت کی اطلاع رکھتے تھے اور اسکے لئے طیاریاں کر رہے تھے۔۔۔ اس موقع پر حضرت کا خاص طور سے لشکرِ اسامہ کی روانگی کا حکم دینا اسی لئے تھا کہ وہ ان تمام لوگوں کے وجود سے مدینہ کو خالی کر دینا چاہتے تھے۔

اگر آپ کا منشا کسی حیثیت سے یہ ہوتا کہ آپ کے بعد اُمورِ خلق کی ذمہ داری ان اشخاص میں سے کسی کے سپرد ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے وقتِ آخر میں ان لوگوں کو لشکرِ اُسامہ کے ساتھ جانے کی تاکید نہ فرماتے ۔۔۔ حضرت کو اس امر میں اتنا اہتمام تھا کہ شدتِ مرض میں جب آنکھ کھلتی تھی تو بار بار یہی تاکید فرماتے تھے کہ لشکر فوراً روانہ ہو جائے ۔۔۔ لوگ رسول خدا کے اس منشاء کو سمجھتے تھے اور اسی لئے تعمیل حکم میں پس و پیش ہو رہا تھا۔ لیکن اسامہ کا لشکر نہ جانا تھا نہ گیا اور گیا اُس وقت جب رسول اللہ کی وفات ہو چکی اور خلافت کا مسئلہ تکمیل کو پہونچ گیا۔

اب رسالتمآب کا مرض انتہائی شدت تک پہونچ گیا ہے، مگر اب بھی اگر کوئی خیال آپ کو ہے تو صرف وہی ایک، کوئی اندیشہ

---

[1] صواعق محرقہ مطبوعہ مصر صفحہ ۷۷۔۔۔ [2] طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۳۶ ۔۔۔ مواہب لدنیہ جلد ا صفحہ ۱۷۹۔ تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۱۷۱۔

تو وہی ایک - ایک بار غشی سے آنکھ کھلتی ہے تو فرماتے ہیں - "ذرا دوات قلم منگواؤ میں تمہارے لئے ایک نوشتہ چھوڑ جاؤں تاکہ میرے بعد تم گمراہی میں نہ مبتلا ہو۔" مگر حضرت عمر نے انکار کر دیا، فرمایا کہ "پیغمبر پر مرض کا غلبہ ہے، اور ہم کو کتاب خدا کافی ہے۔"
صحیح بخاری میں متعدد روایتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک روایت ابن عباس سے ہے کہ:-

"ابن عباس کہتے تھے - ہائے پنجشنبہ کا دن، تم جانتے ہو کہ پنجشنبہ کے دن کیا ہوا۔ رسالتمآب پر مرض کی شدت ہوئی، حضرت نے فرمایا لاؤ میں تمہیں ایک نوشتہ تحریر کر دوں تاکہ میرے بعد تم گمراہ نہ ہو، لوگوں نے اختلاف شروع کیا اور کہا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، ذرا پھر پوچھو، لوگ آپ کے قریب گئے کہ پھر آپ سے دریافت کریں حضرت نے فرمایا "جاؤ، چھوڑ دو مجھ کو، میں جس حال میں ہوں اسی حال میں رہنے دو"[1]

دوسری روایت یہ ہے کہ:-

"جب رسالتمآب کا آخر وقت تھا اس وقت گھر میں بہت سے آدمی موجود تھے حضرت نے فرمایا آؤ میں تمہیں ایک نوشتہ تحریر کر دوں تاکہ میرے بعد تم گمراہ نہ ہو ان میں سے بعض نے کہا کہ حضرت پر مرض کا غلبہ ہے اور تمہارے پاس قرآن تو موجود ہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت جو لوگ گھر میں موجود تھے ان میں اختلاف شروع ہو گیا، کچھ لوگ کہتے تھے قلم دوات دیدو، کچھ اس کے مخالف تھے، جب بہت شور ہوا تو حضرت نے فرمایا کہ اٹھ جاؤ میرے پاس سے"۔

ان دونوں روایتوں میں اختلاف کرنے والوں کا نام درج نہیں ہے، لیکن تیسری روایت سے یہ ابہام بھی دور ہو جاتا ہے اور اس میں صاف صاف تحریر ہے کہ مخالفت کرنے والے حضرت عمر تھے (ملاحظہ ہو بخاری باب قول المریض قوموا عنی)[2]

رسالتمآب کو اس واقعہ سے جتنا صدمہ بھی پہونچا ہو کم ہے، چنانچہ اسی صدمہ کا نتیجہ تھا کہ آپ نے برہم ہو کر سب کو اپنے پاس سے ہٹا دیا۔ لیکن اس منظر کی ایک آخری کڑی اور ہے جو دیکھنے کے قابل ہے، اس داستان کا ایک ٹکڑا اور ہے جو سننے کے قابل ہو اور یہ کسی اور کے منھ کی بات نہیں ہے بلکہ خود جناب عائشہ کا بیان ہے۔

قالت، قال رسول اللہ لما حضرتہ الوفات ادعوالی حبیبی فدعوالہ ابابکر فنظر الیہ ثم وضع راسہ، ثم قال ادعوالی حبیبی فدعوالہ علیا فلما راٰہ ادخلہ معہ فی الثوب الذی کان علیہ فلم یزل یحتضنہ حتی قبض وید ہ علیہ اخرجہ الرازی۔

حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ جب حضرت کا بالکل وقت آخر تھا تو آپ نے فرمایا بلاؤ میرے حبیب کو، کوئی جا کر حضرت ابوبکر کو بلا لایا

---

[1] بخاری مطبوعہ مصر جلد ۳ صفحہ ۵۰ [2] بخاری جلد ۴ صفحہ ۵

آپ نے تکیہ سے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر تکیہ پر سر رکھدیا، دوبارہ فرمایا بلاؤ میرے حبیب کو۔ اب جا کر حضرت عمر کو بلا لائے آپ نے ان کو بھی دیکھ کر تکیہ پر سر رکھ لیا، تیسری مرتبہ پھر آپ نے یہی فرمایا کسی نے علی کو بلا لیا۔ جب آپ نے علی کو دیکھا تو انھیں اپنی چادر میں لے لیا جس کو آپ اوڑھے ہوئے تھے اور برابر اسی طرح لئے رہے یہاں تک کہ حضرت کی روح مبارک نے جسم سے پرواز کی تو آپ کا ہاتھ علی کے اوپر تھا[1]

(نگار) اس میں شک نہیں کہ شیعہ و سُنّی اختلاف کی بنیاد یہی مسئلۂ خلافت و امامت ہے اور اگر آج اس کا فیصلہ ہو جائے تو ان دونوں جماعتوں میں تفریق کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کا امکان نہیں، کیونکہ جس مسئلہ پر ان دونوں مذاہب کی تفریق قائم ہے، اس کو میرے نزدیک اصل مذہب اسلام سے کوئی واسطہ نہیں اور جب کسی مذہب میں فروع کو اصول میں داخل کر لیا جاتا ہے تو وسعت نظر مفقود ہو جاتی ہے اور مفاہمت و اصلاح کی کوئی توقع باقی نہیں رہتی۔

شیعہ و سُنّی دونوں کا مذہب اُصول کے لحاظ سے ایک ہے، کیونکہ توحید و رسالت سے دونوں کو انکار نہیں، رہگیا یہ امر کہ رسول اللہ کے بعد خلافت و امامت کا مسئلہ رسول اللہ کی خواہش کے مطابق طے ہوا یا نہیں، یا یہ کہ جو کچھ ہوا وہ درست تھا یا نادرست، صرف سیاست و تاریخ سے متعلق ہے اور اس کو مذہب سے متعلق کرنا میرے نزدیک کسی طرح جایز نہیں۔

پھر جب یہ نزاع صرف تاریخ و سیاست کی نزاع ہے، تو ہمیں اسی حیثیت سے اس پر نگاہ ڈالنا چاہئے اور اس اختلاف کی نوعیت بھی وہی ہونی چاہئے جو دو مختلف الخیال مورخین یا ماہرین سیاست کے اختلاف کی ہوتی ہے۔ اس کو اخروی جزا و سزا، بہشت و دوزخ یا بخشایش و عدم بخشایش سے کیا واسطہ؟

بہرحال میں آپ کا مضمون شایع کئے دیتا ہوں اور کوشش کروں گا کہ علمائے اہل سنت کے خیالات اس باب میں حاصل کر کے انھیں بھی شایع کر دوں تاکہ جس حد تک روایات مذہبی کا تعلق ہے یہ مسئلہ فریقین کی جانب سے منقح ہو جائے اور اس کے بعد اگر ضرورت ہوئی تو میں اپنی رائے بھی پیش کر دوں گا۔

نیاز

دو ادبی شاہکار

شوپنہار ۔۔۔ فلسفۂ شوپنہار پر ایک بے مثل تبصرہ۔ قیمت ۸؍ (علاوہ محصول)

مثنوی زہر عشق ۔۔۔ مجلد معہ رنگین تصاویر ومقدمات قیمت ۸؍ (علاوہ محصول)

نیجر نگار لکھنؤ

---

[1] ریاض نضرہ مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۱۸۰۔

چند دلچسپ نتائج مطالعہ

قدیم تہذیب ہند و بابل

سندھ میں محکمۂ آثار قدیمہ کی تحقیق و کاوش سے جو کتبے و نقوش عہد عتیق کے دستیاب ہوئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت بابل و ہندوستان دونوں ایک ہی تہذیب و معاشرت کے پابند تھے اور ہندوستان کے قدیم باشندوں (Dravidians) کے متعلق یہ خیال کر وہ سواحل بحر توسط سے بلوچستان ہوتے ہوئے سندھ پہونچے تھے بڑی حد تک درست ہے۔

قدیم بابلی و ہندی رسم الخط کی مماثلت جو ذیل کے نقشہ سے ظاہر ہوتی ہے غالباً اس نظریہ کا کافی ثبوت ہے کہ عہد قدیم میں ہندوستان اور ایشیا کوچک تہذیب و حضارت کے لحاظ سے ایک ہی چیز تھے۔

معنی	تلفظ	سنہ قبل مسیح	بابلی	ہندی
مچھلی	خا	۲۸۰۰		
۳۶۰	سار	۲۹۰۰		
بڑا	غال	۳۰۰۰		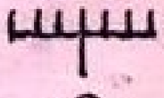
دل، قلب	ساغ	۳۰۰۰		
مُردہ	باد	۲۸۰۰	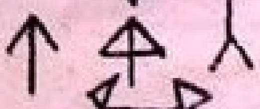	
تک	کر	۳۰۰۰		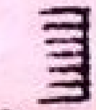
ہاتھ	سو	۲۸۰۰		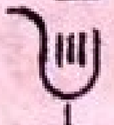
پردہ، آڑ	اوس	۲۸۰۰	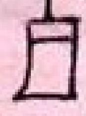	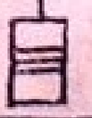
گھر	ای	۳۰۰۰	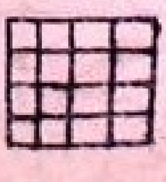	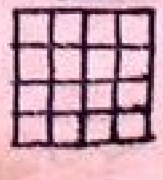

ایک دلچسپ تمثیل

ژان دی لافانیتی نے "دو مرغ" کے عنوان سے فتح و نصرت پر نہایت دلچسپ تمثیلی رنگ میں اظہار خیال کیا ہے۔ لکھتا ہے:-

دو مرغوں میں نہایت گہری دوستی تھی جب ایک مرغی کا قدم درمیان آیا تو فوراً جنگ چھڑ گئی۔

اے عشق! تو نے ٹرائے کو تباہ و برباد کر دیا اور تو ہی وہ تھا جس نے کہ دریائے زنیتھس کو دیوتاؤں کے خون سے رنگین کر دیا۔

ہمارے دونوں مرغ ضد اور ہٹ سے باہم گو بہت عرصہ تک لڑتے رہے اور جنگ کی شہرت سارے قرب و جوار میں پھیل گئی —— تمام کلغی دار خرفا اس نظارے کو دیکھنے جمع ہو گئے اور آخر کار فاتح کو ایک سے زیادہ حسین بال و پر والی مرغیاں انعام میں عطا کی گئیں۔ مفتوح مرغ فرار ہو گیا، اس نے اپنے آپ کو تنہائی و عزلت کے پردوں میں چھپا لیا اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت پر اپنی محبوبہ کے لئے آہ و بکا کرنے لگا، وہ محبوبہ، جس پر ایک رقیب نے فتح پا کر خود اُس کی نگاہوں کے سامنے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ خیال اُس کے دل میں روزانہ نفرت اور شجاعت کی آگ بھڑکاتا رہتا تھا۔ اُس نے اپنی چونچ تیز کی، اپنے بازو ہوا میں پھٹ پھٹا کے ورزش کی، اور حاسدانہ قہر و غضب سے اپنے آپ کو مسلح کیا —— یہ سب بہرحال محض بیکار تھا —— فاتح چھت پر پہونچا اور وہاں اپنی فتح کے راگ گانے لگا ایک عقاب نے اُس کی تیز اور چبھتی ہوئی آواز سُنی - آخر کار اس کا سارا گھمنڈ عقاب کے پنجوں کا شکار ہو گیا۔ اور اُس کا رقیب اُس کی محبوبہ کے ساتھ عیش میں مصروف ہو گیا۔

تقدیر پر بھروسہ بیکار ہے اگر فتح کے بعد اپنی حفاظت کا خیال دل سے محو ہو جائے۔

غالب کے چار شعر

بیا و جوشش تمنائے دیدنم بنگر — چو اشک از سر مژگاں چکیدنم بنگر
زمن بہ جرم تپیدن کنارہ می کردی — بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر
شنیدہ ام کہ نہ بینی و ناامید نیم — نہ دیدنِ تو شنیدم، شنیدنم بنگر
دمید دانہ و بالید و آشیانگہ شد — در انتظار ہماں دام چیدنم بنگر

بھوت پریت اور شیخ محمد عبدہ

شیخ محمد عبدہ کے ایک تلمیذ رشید کا بیان ہے کہ ایک بار تفسیر کا درس ہو رہا تھا اور علامۂ شیخ محمد عبدہ کسی ایسی آیت کی تفسیر بیان کر رہے تھے جس میں بھوت پریت کا بھی ذکر ضمناً آ گیا۔ انھوں نے ایک واقعہ خود اپنا بیان کیا کہ:-

"میں بہت کمسن تھا ایک رات کسی گلی سے گزرنے کا اتفاق ہوا، جو تنگ بھی تھی تاریک بھی اور لوگوں میں بھوتوں کا

مسکن ہونے کی وجہ سے بہت بدنام تھی، تھوڑی دیر میں میں نے ایسا محسوس کیا کہ کوئی شخص گاڑی پر بیٹھا ہوا میرا تعاقب کر رہا ہے، خوف سے میں نے قدم تیز کر دئے تو گاڑی کی آواز اور زیادہ تیز ہوگئی اور میں گھبرا اُٹھا۔ لیکن اس واقعہ میں حقیقت صرف اتنی تھی کہ میں نے کپڑے بغیر ڈھیلے ہوئے نئے پہنے تھے اور میرے خوف نے ان کی سرسراہٹ کو گاڑی کی آواز میں تبدیل کر دیا"۔

حقیقت یہ ہے کہ بھوت پریت کے جتنے افسانے مشہور ہیں وہ سب واہمہ کی خلاقیاں ہیں اور ان کی اصلیت کچھ نہیں

حُسنِ اتفاق کی عجیب مثال

ہکسلے انگلستان کا نہایت مشہور مفکر و فیلسوف تھا، ایک بار وہ کسی لڑکے کا امتحان لے رہا تھا، یہ لڑکا اس کے ہر سوال کا جواب صحیح صحیح دیتا تھا اور ہکسلے حیران تھا۔ آخر کار اس نے سوچا کہ اس سے کوئی ایسا سوال کرنا چاہئے جس کا جواب دینا اس کے امکان میں نہ ہو۔ چنانچہ اس نے پوچھا کہ "فلاں جھیل کتنی بلندی سے گرتی ہے"۔ یہ جزیرۂ جمیکا کی ایک نہایت معمولی جھیل تھی جس کا علم بھی لوگوں کو نہ تھا لیکن ہکسلے خود ایکبار دورانِ سفر میں وہاں مقیم ہوا تھا۔

لڑکے نے اس سوال کا جواب بھی بغیر کسی تامل کے دیا اور کہا کہ "جس جھیل کو آپ پوچھ رہے ہیں وہ ۲۲۶ فٹ کی بلندی سے گرتی ہے"۔

ہکسلے نے گھبرا کر کہا کہ "تو انسان ہے یا کوئی اور مخلوق جو ہر بات سے واقف ہے"۔ اس نے کہا کہ "یہ جھیل تو میرے باپ کی ملکیت ہے اور میں وہیں پلکر بڑا ہوا ہوں، مجھے اس کا حال نہ معلوم ہوگا تو کیا آپ کو ہوگا"۔

مومن کی بعض لطیف فارسی ترکیبیں

موے نہ عشق میں جب تک وہ مہرباں نہ ہوا
بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا

وہ آئے بہرِ عیادت تو تھا میں شادیٔ مرگ
کسی سے چارۂ بیدادِ آسماں نہ ہوا

لگی نہیں ہے یہ چُپ لذتِ ستم سے کہ میں
حریفِ کشمکشِ نالہ و فغاں نہ ہوا

شکر اثر تھا گلۂ دشمناں
نالہ مرے کام سے یار و گیا

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا
میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

پھرنے سے شام وعدہ کھٹکے یہ کہ سور ہے تھے
آرام شکوۂ ستم اضطراب تھا

دیتے تکلیف شبِ ہجر میں آہ، اپنے پاس
نقدِ جاں پیشکشِ مرگ کے قابل نہ ہوا

جوشِ قلق نے اس کو بھی دیوانہ کر دیا
پہلے تو ورنہ طبع تحمل میں رم نہ تھا

میری نگاہ خیرہ دکھاتے ہیں غیر کو
بیطاقتی پہ سرزنشِ ناز دیکھنا

محوِ جفا ستمکشِ الطاف کب ہوا
رحم اس کو میرے حال پہ آیا غضب ہوا

کیا رشکِ غیر تھا کہ تحمل نہ ہو سکا
میں جاں گرِ حریف تغافل نہ ہو سکا

شعلۂ دل کو نازِ تابش ہے
اپنا جلوہ ذرا دکھا دینا

فلسفۂ لذت

عرب کا ایک شاعر، ایک خاتون سے محبت کرتا تھا اور اس کے عدم التفات نے اس کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اس کے فراق میں اشعار کہتا تھا، اس کی گلی میں جا جا کر بلند آواز سے وہ اشعار گاتا تھا تاکہ کسی طرح محبوبہ کے کان تک اس کی التجائے شوق پہونچ جائے۔

اتفاق سے یہ خاتون اور اس شاعر کی بیوی دونوں ایک دوسرے سے واقف تھیں جس کا علم اس کو نہ تھا۔۔۔

ایک دن خاتون نے اس کی بیوی سے کہا کہ "تمہارے شوہر نے ناک میں دم کر رکھا ہے اور کسی طرح پیچھا ہی نہیں چھوڑتا، کیا کروں، سخت حیران ہوں" وہ اپنے شوہر کی یہ حرکت معلوم کر کے بہت نادم ہوئی، اور دونوں نے باہم مشورہ کر کے ایک تدبیر سوچ لی۔

اس کے دوسرے ہی دن عاشق مہجور پھر اس کی گلی سے اشعار گاتا ہوا نکلا۔ یہ گھر سے باہر نکل آئی اور نہایت محبت آمیز لہجہ میں اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا کہ "آج رات کو میں تم سے ملونگی، آدھی رات کے بعد یہ دروازہ کھول کر خاموشی سے اندر آجانا"

یہ سنکر جو حالت عاشق کی ہوئی ہوگی ظاہر ہے۔ شام کرنا مشکل ہو گیا، لیکن چونکہ اپنی بیوی سے ڈرتا بھی بہت تھا، اس لئے

وہ سوچ رہا تھا کہ کس بہانہ سے گھر چھوڑے، اتفاق سے شام کو اس کی بیوی بھی کسی ضرورت سے اپنے ایک عزیز کے یہاں چلی گئی اور اس لئے یہ خلش بھی اس کی دور ہو گئی۔

رات کو حسب قرارداد، یہ اپنی محبوبہ کے مکان پر پہونچا اور دروازہ کھلا پاکر اندر چلا گیا۔ لیکن کمرہ بالکل تاریک تھا۔ اس نے کہا کہ روشنی کیوں نہیں ہے تو اس خاتون نے نہایت آہستگی سے جواب دیا کہ "چپ رہو، کوئی سن لیگا"

الغرض جب اسی تاریکی میں "شوق وصل و شکوۂ ہجراں" سبھی کچھ بیان ہو گیا۔ تو وہ خاتون اٹھی اور چراغ روشن کر کے ایک ایسا دوہتڑ اس کی پیٹھ پر لگایا کہ حواس گم ہو گئے۔ اب جو یہ آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہیں تو سامنے بیوی کھڑی ہوئی ہے۔

اس وقت جو جواب شاعر نے دیا وہ ذکاہی و نفسیاتی ہر لحاظ سے عجب و غریب تھا۔ اس نے مار کھانے کے بعد منھ پھیر کر اپنی بیوی کو دیکھا اور نہایت سنجیدگی سے کہا کہ:-

"واللہ ما ارورک حلالاً و ما اطیبک حراماً"

یعنی قسم خدا کی حلال ہونے کی حالت میں تو کیسی ذلیل تھی لیکن آج حرام ہونے کے بعد کتنی پرلطف ثابت ہوئی!

مرقع چغتائی اس کتاب کا پہلا اڈیشن ایک سو دس روپیہ فی جلد تین ماہ کی قلیل مدت میں فروخت ہو گیا۔ دوسرا اڈیشن سترہ روپیہ فی جلد ہاتھوں ہاتھ نکل گیا اب تیسرے اڈیشن کی قیمت بارہ روپیہ فی جلد مقرر کی گئی ہے حجم تین سو صفحات سے زاید بڑی تقطیع رنگین تصاویر جن کے بلاک یورپ کے کارخانوں میں بنے ہیں۔ قیمت عہ روپیہ

ضبط نفس از ڈاکٹر عابد حسین صاحب۔ مہاتما گاندھی کی یہ کتاب ابھی شایع ہوئی ہے اور تمام نوجوانوں کو خواہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ اس میں بہترین مشورہ دئے گئے ہیں اور ضبط نفس کے وہ طریقہ تجویز کئے گئے ہیں جو انسان کو انسان بنا سکتے ہیں قیمت ۱۲ار

مسلمانوں کی آیندہ تعلیم سید سلیمان صاحب ندوی کی تازہ ترین تصنیف جو مکتبہ جامعہ نے اسی مہینہ شایع کی ہے ارباب فکر کے مطالعہ کی چیز ہے۔ قیمت ۸ر

روح تہذیب خواجہ غلام السیدین ایم اے (لیڈز) پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا فاضلانہ مقالہ جو آپ نے اردو اکاڈمی جامعہ ملیہ کے ایک جلسہ میں پڑھا۔ قیمت ۸ر

نیم شب (ڈراما) پروفیسر اشتیاق حسین صاحب قریشی ایم۔ اے کا تازہ ترین ڈراما اگر ہندوستان میں پچاس برس بعد اشتراکیت کا زور ہوا تو ملک کی کیا حالت ہوگی یکم دسمبر کو سینٹ اسٹیفنس کالج کی ڈرامٹک سوسائٹی اسے کھیل بھی چکی ہے۔ حاضرین نے بہت پسند کیا۔ قیمت ۸ر

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

باب المراسلۃ والمناظرہ

ادارۂ فحاشی اور مرد

(اختر ریحانہ - دہلی)

نیاز صاحب، تسلیم

شاید آپ اس کو اپنے موقر رسالہ کی توہین سمجھیں گے کہ مجھ جیسی "لعنت زدۂ روزگار" بھی اس کو دیکھے، اگست سنہ ۴۲ء کے رسالہ میں دفعتاً "کسبی" کا عنوان دیکھکر کچھ حیرانی سی ہوئی - پڑھنا چاہتی تھی - لیکن یہ خیال کرکے رک گئی کہ روزانہ ۲۴ گھنٹوں میں لعنت و نفرین کے جو جوتے میرے سر پر پڑتے رہتے ہیں انھیں کو کسی نئے قالب میں ڈھالکر آپ نے بھی اپنے رسالہ کی زینت بنایا ہوگا ——— "ان سے بچو، یہ رنگین ناگنیں آدمی کو دونوں جہان میں کہیں کا نہیں رکھتیں، ان کی روح داغدار ہوتی ہے اور انکی ہر حرکت سراسر معصیت وغیرہ وغیرہ ——— "مگر پہلی سطر پڑھنے کے بعد خود بخود آگے پڑھتی چلی گئی حتیٰ کہ سارا مضمون ختم ہوگیا؛ اگرچہ فاضل مضمون نگار کے منطقی استدلال اور عالمانہ طرز بیان کو بخوبی نہ سمجھ سکی، تاہم کئی بار پڑھا اور سمجھنے کی کوشش کی - حیران تھی کہ یا خدا یہ کس کی جرأت ہے جو ساری سوسائٹی کو علانیہ چیلنج دے رہا ہے؟ پھر اس کے بعد کے تمام رسالوں کو اشتیاق سے دیکھتی رہی لیکن تعجب تھا کہ کسی "مرد خدا" نے اس کے خلاف آواز کیوں بلند نہیں کی - اپنے ذہن میں اسکی مختلف تاویلیں کرتی تھی - بالآخر فروری کا نگار آیا؛ دیر تک دیکھتی رہی، سوچتی رہی ——— اور روتی رہی!

نیاز صاحب، سب کہتے ہیں کہ کسبی بری ہے لیکن خدا کے لئے مجھے یہ تبلا دیجئے کہ ان کہنے والوں میں سے کتنے ایسے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں کم از کم دو چار معصوم لڑکیوں کو کسبی نہ بنایا ہو، جانیے اور

انکی زندگیوں کو ٹٹول کر دیکھئے کہ ان کے چچا اور پھوپھی کی لڑکیاں، ان کے گھر میں آنے جانے والیاں، ان کے گھر کی خادمائیں، ان سے پڑھنے والی بچیاں —— غرض کہ کتنی ہیں جنکو یہ "معصوم فرشتے" محبت اور خلوص کے نام پر، ادب و شاعری کے نام پر، نکاح و شادی کے نام پر، بلند ذوقی اور رومانیت کے نام پر، رشتہ داری اور قرابت کے نام پر، مستقبل کی خوشگوار توقعات کے نام پر —— دن رات رومالوں، ناولوں، شب تاپچوں، انگوٹھیوں اور ساریوں کے تحفے پیش کرکر کے "کسبی" بناتے رہتے ہیں !!

نیاز صاحب، کون ماں کے پیٹ سے افلاطون اور ارسطو بنکر پیدا ہوتا ہے! لڑکی کا بھی یہی حال ہے۔ پھر اگر وہ خاموش، شرمناک اور بالکل سادہ ہو، داغ اور طبل کے اشعار کو نہ سمجھتی ہو اور نہ پڑھتی ہو تو "تعلیم یافتہ نوجوان کی نظروں میں وہ "منہ لگانے" کے قابل نہیں۔ اور اس لئے نفرتاً والدین کے کندھوں پر ایک مستقل عذاب —— لیکن اگر وہ ذہین ہے، طباع ہے، چست و چالاک ہے تو پھر اس کا وہ حشر ہوتا ہے جو ابھی عرض کیا گیا

نیاز صاحب، میں اپنی داستان لے کر بیٹھنا نہیں چاہتی لیکن اتنا کہوں گی کہ مجھے میری زندگی کے بارھویں سال سے جس نے "کوٹھوں" پر بھیجنے کے لئے تیار کیا وہ میرا "روحانی باپ" تھا اور میرا خالہ زاد بھائی، میرے سامنے زندگی کو جسطرح پیش کیا گیا مجھے اسی طرح سمجھنا چاہئے تھا۔ حتی کہ خواب ختم ہوا، آنکھ کھلی اور میں تنہا تھی !!

مسجدوں کے ملا، کالجوں کے طلبہ، اخباروں کے اڈیٹر، ادیب، انشاپرداز، شاعر، واعظ، بڑے اور چھوٹے —— یہ سب چاہے آپس میں کتنے ہی مختلف الخیال کیوں نہ ہوں لیکن "عورت" کو درجہ بدرجہ اس انحطاط تک پہونچانے میں ایک حیثیت سے ایک دوسرے کے شریک ہیں۔

نیاز صاحب، یہ کسبی کو برا کہنے والے کبھی اپنے دل پر ہاتھ رکھکر یہ بھی غور کرتے ہیں کہ ان کے قبا کے دامن میں کتنی کسبیاں چھپی ہیں۔ اور یہ معصیت سے روکنے والے راست کردار، کبھی اپنے گریبان میں منہ ڈالکر یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ دن رات کتنی لڑکیوں کو (حسب استطاعت) اپنی نظروں، گفتگوؤں، شعروں، مضمونوں اور خطوں سے دن رات زینت آغوش بنانیکی سعی کرتے رہتے ہیں —— خدا کی قسم یہ جھوٹے ہیں، اگر ان کا بس چلے تو پہلے یہ ساری کائنات کو لڑکی بنا دیں اور پھر ہر لڑکی کو کسبی

نیاز صاحب، آپ خفا ہوں گے کہ ایک لڑکی اور اتنی منہ پھٹ! لیکن آپ کو کیا معلوم کہ میں نے اس رسالہ کو پڑھنے کے بعد سے کتنی مرتبہ آپ کو خط لکھنے کا ارادہ کیا اور پھر نہ معلوم کن کن چیزوں سے ڈر کر رک گئی۔ اور اب جو لکھ رہی ہوں تو کتنی رک رک کر،

نیاز صاحب، آپ کسی طرح میری حالت کا صحیح تصور نہیں کر سکتے۔ دنیا کا ہر قریب و بعید انسان ہمکو کسی نہ کسی طرح "کھانا چاہتا ہے" اور پھر کھا لینے کے بعد ہم سے اس لئے نفرت کرتا ہے کہ اس نے ہمیں کیوں دکھایا"

نہ معلوم میں آپ کو یہ لکھ کیوں رہی ہوں۔ لیکن اگر میں اپنی شخصیت کو اس سے زیادہ بے نقاب کرنے سے معذور رہی تو آپ سے پوچھتی کہ "جناب بزمی" کون ہیں، تاکہ میں ان سے براہ راست یہ معلوم کرسکتی کہ اس مضمون کے لکھنے کے بعد ان کے حلقۂ احباب نے کیا گوشمالی کی۔

(**نگار**) جس حد تک آپ کے ذاتی حالات و واقعات کا تعلق ہے میں سوائے اس کے کیا عرض کرسکتا ہوں کہ یقیناً آپ پر بہت ظلم کیا گیا، لیکن سوال یہ ہے کہ ان تمام بلند شریفانہ احساسات کے نشوونما پانے کے بعد آپ نے عملاً احتجاج کی کوئی صورت اختیار کی یا نہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ ایک انسان کسی مخصوص ماحول میں عرصہ تک زندگی بسر کرنے کے بعد کچھ ایسا مجبور ہو جاتا ہے کہ نہ اس ماحول سے علیحدہ ہونیکی جرأت اس میں باقی رہتی ہے اور نہ سوسائٹی کی طرف سے ہمت افزائی ہوتی ہے، تاہم انسانی آبادی میں اگر سو شیطان ہیں تو دو چار انسان بھی مل جاتے ہیں اور متعدد مثالیں اس امر کی ملیں گی کہ آپ ایسی احساس رکھنے والی عورتوں کا جواب کافی ایثار و ہمدردی سے دیا گیا

بہرحال یہ آپ کے مخصوص حالات ہیں اور ان کے متعلق میں یا کوئی کیا کہہ سکتا ہے جب تک تفصیلی علم نہ حاصل ہو۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ سوسائٹی کی عام اخلاقی حالت کا جو اندازہ آپ نے کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور پیشہ ور عورتوں سے کہیں زیادہ قابل الزام وہ مرد ہیں جو بظاہر نہایت مہذب و شائستہ، حد درجہ شریف و نستعلیق نظر آتے ہیں، لیکن اپنے اخلاق کے لحاظ سے حقیقتاً وہ بھیڑیے ہیں جو بکری کی کھال اوڑھے ہوئے آہستہ آہستہ سماج میں ہلاکت پھیلا رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مرد، عورت کا تعلق بالکل فطری چیز ہے اور چونکہ اس تعلق میں مرد کے اندر قدرتاً ایک ہلکی سی کیفیت عجز و فتادگی کی پیدا ہوتی ہے، اس لئے آج نہیں، بلکہ عہد وحشت ہی میں مرد نے اپنی اس جذباتی کمزوری کو اپنی جسمانی قوت سے پورا کرنا چاہا اور باوصف اس کے کہ اسکی روح عورت کے لئے یکسر التماس و سوال تھی، اس نے اپنے اعصاب کی قوت، ہاتھ پاؤں کی مضبوطی، اور پہاڑ ہلانے والی جسمانی طاقت کا مظاہرہ کرکے، اپنے اس عجز کو کبھی عورت پر ظاہر ہونے نہیں دیا اور اس کے اندر ہمیشہ یہ غلط احساس پیدا کیا کہ وہ مرد کی حفاظت کی محتاج ہے، اور تنہا کچھ نہیں کرسکتی ——

اس کے بعد جب ذہنی و تمدنی ترقی وسیع ہوئی تو مرد کا یہ احساس بھی اس کے ساتھ بڑھتا رہا لیکن اس فرق کے ساتھ کہ پہلے عورت کو مجبور و پابند رکھنے کے لئے کوئی خاص قاعدہ نہ تھا، اور اب اس نے عورت کو شکنجہ میں کسنے اور اپنے آپ کو آزاد رکھنے کیلئے آئین و قانون وضع کرنے شروع کئے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قرونِ ماضیہ میں ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے جب عورت برسرِ اقتدار تھی اور کہا جاتا ہے کہ اس کا ثبوت ان دیویوں کا وجود ہے جو عہد قدیم کے صنمیات میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ قیاس درست نہیں۔ کیونکہ عہد وحشت کے مرد کا کسی دیوی کی پرستش کرنا حقیقتاً صرف احساسِ عجز کے بنا پر تھا جو فطری طور پر عورت کے مقابلہ میں اس کے

اندر پایا جاتا تھا، لیکن جس حد تک کاروبار دنیا کا تعلق ہے اس نے ہمیشہ اپنی ہی پرستش عورت سے کرائی اور اپنی خواہشات کے مقابلہ میں اس کے جذبات کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ عورت کی رضامندی حاصل کئے بغیر اس کو بیوی بنالینا، ایک ہی وقت میں متعدد مردوں سے تعلق رکھنے پر مجبور کرنا، جب چاہنا چھوڑ دینا اور جب جی میں آئے قیمت ادا کرکے دوسری عورت لے آنا، اور اس سے بھی زیادہ ماں بہن کی تمیز اٹھا دینا، یہ سب مرد ہی کے قابل فخر کارنامے ہیں اور تاریخ عالم میں کوئی زمانہ عورت پر ایسا نہیں گذرا جب خود اس نے ان بدتمیزیوں کی ابتدا اپنی طرف سے کی ہو۔ اس کے ساتھ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ پہلے تو خود اسی نے عورتوں کی آبروریزی کی۔ خود ہی ان کو عصمت فروشی پر مجبور کیا۔ اور پھر خود ان کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگا۔

آج مرد "ادارۂ فحاشی" کو انسانیت کے لئے ذلت و لعنت قرار دیتا ہے، مالی تباہیوں کا ذمہ دار پیشہ ور عورتوں کو قرار دیتا ہے، مکروہ بیماریوں اور نسلی خرابیوں کا سبب کسبیوں کو ظاہر کرتا ہے، لیکن اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ یہ لعنت اسی کی لائی ہوئی ہے، یہ بربادیاں اسی کے ہاتھوں نے پیدا کی ہیں اور یہ جسمانی واعذاریاں خود اسی کے وحشیانہ جذبات کا نتیجہ ہیں۔ اگر آج کوئی شخص اس تحقیق میں کامیاب ہو جائے کہ دنیا میں کس مخصوص خاندان یا قبیلہ سے فحاشی کی ابتدا ہوئی تو یقیناً اس خاندان یا قبیلہ کی سب سے پہلی وہ عورت جس نے اول اول فحاشی اختیار کی ہوگی وہی ہوگی جسے پہلے مرد نے خراب کیا ہوگا اور پھر بعد کو غارتِ حسن و شباب کے بعد ذلت کی زندگی بسر کرنے کے لئے گھر سے باہر نکال دیا ہوگا۔

ایک معلم اخلاق احتجاج کرتا ہے کہ کسبیوں کے وجود سے دنیا کو پاک کر دینا چاہئے، لیکن اگر ہمارے کان ہوں تو ہم سنیں کہ عورت کی فریاد کیا ہے اور وہ کس کس طرح مرد سے پناہ مانگ رہی ہے جو اسے کسبی بننے اور کسبی رہنے پر مجبور کر رہا ہے۔ ایک ڈاکٹر قوم کے نوجوانوں کی بیماریوں کا سبب پیشہ ور عورتوں کو بتا کر ان کے فنا کر دینے کا مشورہ دیتا ہے۔ حالانکہ اصولاً وہ خود مردوں کے مٹا دئے جانے کا مطالبہ کر سکتی ہیں، جنھوں نے ان کو یہ تمام بیماریاں لگائیں اور جو تمام تر ان کی اور اپنی خرابیٔ صحت کے ذمہ دار ہیں ——

آپ نے اس باب میں جو کچھ لکھا ہے اس سے مجھے حرف بحرف اتفاق ہے، اور اس میں مطلقاً شک کی گنجائش نہیں کہ وہ لوگ جو آج عمر ڈھل جانے کے بعد اپنے آپ کو بڑا پرجوش معلم اخلاق کہتے ہیں، حقیقتاً وہی ہیں، جن کی جوانی سب سے زیادہ ناپاک بسر ہوئی ہے اور جنھوں نے خانقاہوں کے حجروں میں چھپ کر، بازار پر بیٹھنے والی کسبیوں سے زیادہ ادارۂ فحاشی کے رواج میں مدد دی ہے۔

بہرحال ماضی کے استبداد نے جو طرح جور و ستمرانی کی ڈالدی ہے اس کے اثرات تو اب مٹ نہیں سکتے اور یہ ناممکن ہے کہ وہ مرد جو پہلے علانیہ عورت کی عصمت کو خراب کر دیتا تھا، اب چوری چھپے بھی اس حرکت سے باز آجائے، لیکن اس دور میں ایک انقلاب ضرور آنے والا ہے، جو یقیناً فحاشی کا محو کرنے والا تو نہ ہوگا، لیکن اس کی نوعیت کو بدل کر مرد سے اس کی گذشتہ تخریب اخلاق کا انتقام عورت کی طرف سے لے کر رہے گا۔

عورت جب تک جاہل تھی، نہ وہ اپنے جائز حقوق سے آگاہ تھی نہ ان عطایائے فطرت سے جو مرد ہی کی طرح اس کی خلقت میں بھی ودیعت کئے گئے تھے۔ لیکن اب کہ وہ اپنی اہمیت اور اپنی دماغی صلاحیت سے واقف ہوگئی ہے وہ مرد سے بے نیاز ہوتی جا رہی ہے اور

اپنا وجود علیحدہ قائم کرنے میں مرد کے جذبات اسی طرح ٹھکرا دے گی، جس طرح اب سے قبل مرد کیا کرتا تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ آپ کو کبھی جدید تعلیم یافتہ عورت کے مطالعہ کا موقع ملا ہے یا نہیں، لیکن بدقسمتی یا خوش قسمتی سے چونکہ مجھے روزانہ اس کی فرصت نصیب ہو جاتی ہے اس لئے میں جانتا ہوں کہ وہ مرد سے گذشتہ مظالم کا انتقام کس کس طرح لے رہی ہے اور وہی مرد جو پہلے عورت کی زراسی بدعنوانی پر تیغ خاراشگاف لے کر کھڑا ہو جاتا تھا اب اس کے سینہ پر عورت کیسی کیسی چھریاں چلا رہی ہے اور وہ ہے کہ خون کے سے گھونٹ پی پی کر رہ جاتا ہے۔ اس نے مرد کے بنائے ہوئے قانونِ اخلاق کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا ہے، اسنے مرد کے تراشے ہوئے آئین شرم وحیا کو ٹھکرا کر اس کے منھ پر کھینچ مارا ہے، اور اب وہ مرد کے کام و دہن کو ان تمام تلخیوں کے گوارا کرنے پر مجبور کر رہی ہے جو کسی وقت عورت کو گوارا کرنے پڑے تھے —— الغرض اب عورت آزاد ہے، جسمانی و اخلاقی دونوں حیثیتوں سے، پہلے وہ مرد کا کہنا ماننے پر مجبور تھی کیونکہ کسب معاش میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا، لیکن اب کہ وہ مردوں کے دوش بدوش ہر کام پر آمادہ ہے، اور اپنی پردہ بالی کی بندشیں علیحدہ کر چکی ہے، اپنا قانون اخلاق و معاشرت خود علیحدہ بنائے گی اور مرد کو اس کی پابندی پر مجبور ہونا پڑیگا، خواہ اس کو کتنے ہی "جورِ رقیب" کے صدمے کیوں نہ اٹھانا پڑیں ——

پھر آپ کو معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا —— جب عورت کی آزادی کی انتہا ہو جائے گی، جب سارا عالم موجودہ اصول اخلاق کے لحاظ سے یکسر ادارۂ فحاشی ہو کر رہ جائے گا، جب عورت کی داغداری و عصمت کا مفہوم سوائے اِس کے کچھ نہ ہوگا کہ وہ کسی کی طرف مائل ہے اور کسی کی طرف نہیں —— اُس وقت مرد، مجبور و ذلیل مرد، اخلاق و معاشرت کا ایک جدید قانون مرتب کرے گا، جس میں نہ رشتۂ ازدواج کوئی چیز رہے گا، نہ ضبطِ نفس و جذبات، دنیا ایک فردوس ہوگی "خیالی" (حقیقی) نہیں عملی، احساسی، جیتی جاگتی —— جہاں عورت مرد کے ساتھ کھیلتی رہے گی جب تک اس کا جی چاہے اور مرد عورت کے ساتھ کھیلتا رہے گا جب تک عورت اس کی اجازت دے —— پھر اس زندگی کے جدید نظریئے قائم ہوں گے، بہت سی نفسیاتی پاکیزگیوں کا وجود ان میں ثابت کیا جائے گا —— اور —— ہر چند اس وقت بھی مرد میں اتنی جرأت تو نہ ہوگی کہ وہ اپنی عورتوں کو کسبی کہہ سکے، لیکن کسبیوں کے سامنے اپنی آغوش کھول کر یہ کہنے میں، اس کو مطلق دریغ نہ ہوگا کہ

"بیا بیا عراقی تو زخاصگان مائی"

محشرستان جناب محشر عابدی کے منتخب افسانوں کا مجموعہ جو مختلف رسائل میں شایع ہو کر پبلک سے کافی خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ مجلد عہ غیر مجلد ۸ علاوہ محصول۔

شعرستان۔ جناب سید محمود اعظم فہمی ترمذی کی ادبی، اخلاقی، نظموں اور غزلوں کا منتخب مجموعہ معہ جگر مراد آبادی کے مختصر تبصرہ اور جناب منظور سروش بھوپالی کے مقدمہ کے۔ $\frac{20 \times 30}{16}$ کے ۱۲۰ صفحات قیمت عہ علاوہ محصول۔

مینجر نگار لکھنو

باب الاستفسار

علامہ ابن تیمیہ

(جناب غلام جیلانی صاحب برق - ایم ۔ اے ۔ گورنمنٹ کالج ہشیار پور)

۱۔ ابن تیمیہ کے سوانح حیات کس کتاب میں مفصل ملیں گے۔

۲۔ عربی، انگریزی، فارسی یا اردو زبان میں اگر کوئی کتاب اس موضوع پر جناب کے علم میں ہو تو مطلع فرمائیے۔

۳۔ ابن تیمیہ کے تمام تصانیف کی تعداد کیا ہے۔ اب کسقدر باقی ہیں اور ہند یا مصر میں کتنی دستیاب ہو سکتی ہیں۔

۴۔ کیا آپ نے بہ سلسلہ استفسارات اس موضوع پر کبھی روشنی ڈالی ہے۔

(نگار) (۱) - (۲) — ابن تیمیہ کے حالات آپ کو جن کتابوں سے مل سکتے ہیں، ان کی فہرست حسب ذیل ہے۔

طبقات الحفاظ (السیوطی) — تذکرۃ الحفاظ (الذہبی) — فوات الوفیات (القطبی) — طبقات (السبکی) —

تاریخ ابن الوردی — جلاء العینین (آلوسی) —

علاوہ ان کے ایک کتاب "الکواکب الدریہ فی مناقب ابن تیمیہ" مرعی بن یوسف الکرمی کی ہے، جس میں صرف ابن تیمیہ کے حالات سے بحث کی گئی ہے۔

(۳) کہا جاتا ہے کہ ابن تیمیہ نے ۵۰۰ کتابیں تصنیف کیں لیکن ان میں زیادہ سے زیادہ ۵۰ - ۶۰ باقی ہیں۔ ایک مجموعہ جس میں تقریباً ۳۰ رسائل جمع کر دیے گئے ہیں مجموعات الرسائل الکبریٰ کے نام سے شایع ہو چکا ہے اس کے خاص خاص رسالے یہ ہیں (۱) رسالۃ الفرقان بین حق والباطل (۲) معارج الوصول (یہ کتاب قرامطہ کے جواب میں لکھی گئی ہے جو کہتے تھے کہ انبیا جھوٹ بول سکتے ہیں) (۳) التبیان فی نزول القرآن (۴) الوصیۃ الصغریٰ (۵) الوصیۃ الکبریٰ (۶) الارادۃ والامر وغیرہ۔

اور خاص خاص تصانیف یہ ہیں :- الفرقان بین اولیاء الرحمٰن و اولیاء الشیطان ——— الواسطہ بین الحق والخلق ——— رفع الملام عن الائمۃ الاعلام ——— کتاب التوسل والوسیلۃ ——— الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح ——— الجوامع فی السیاسۃ الالٰہیۃ والآیات النبویہ ——— تفسیر سورۃ النور ——— کتاب صارم المسلول علی شاتم الرسول ——— المسئلۃ النصیریہ ——— کتاب الرد علی النصاریٰ ——— مسئلۃ الکنائس ——— الکلام علی حقیقۃ الاسلام والامام ——— کتاب فی اصول الفقہ ———

ان میں سے سب دستیاب ہوتی ہیں۔ بعض یہیں ہندوستان میں طبع ہوئی ہیں، بعض مصر میں اور بعض مستشرقین یورپ نے شائع کی ہیں (م) نگار میں غالباً اس وقت تک کوئی مضمون ابن تیمیہ کے حالات پر شائع نہیں ہوا، مختصراً درج کرتا ہوں :-

اس کا پورا نام مع القاب و کنیت کے یہ ہے :- تقی الدین ابو العباس احمد بن عبد الحلیم بن عبد السلام بن عبد اللہ بن محمد بن تیمیۃ الحرانی الحنبلی ——— ۱۰ ربیع الاول ۶۶۱ھ کو بمقام حران پیدا ہوا۔ لیکن فتنۂ مغل کے وقت اس کے باپ نے مع اپنے تمام خاندان کے دمشق میں پناہ لی اور یہیں ہمارے ہیرو کی تعلیم شروع ہوئی۔ چونکہ اس کا باپ خود حنبلی فقہ کا بڑا ماہر تھا اس لئے علاوہ دیگر اساتذۂ وقت کے خود اپنے باپ سے بھی پڑھا۔ بیس سال کے عمر تک یہ فارغ التحصیل ہو گیا اور جب ۶۸۱ھ میں اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تو یہ اس کا جانشین ہوا۔ یہ قرآن، حدیث و فقہ کا بڑا ماہر تھا لیکن چونکہ اپنے طریق استدلال میں نسبتاً زیادہ آزاد و روشن خیال تھا اس لئے اکثر قدامت پرست علماء اس کے دشمن ہو گئے تھے۔ ۶۹۱ھ میں یہ حج کی غرض سے مکہ گیا۔ ۶۹۹ھ میں بمقام قاہرہ اس نے صفات خداوندی کے متعلق ایک استفسار کا جواب ایسا دیا کہ شافعی جماعت اس سے برہم ہو گئی۔ اور پروفیسری کی خدمت اس کی چھن گئی۔ دوسرے سال وہ مغلوں کے خلاف تبلیغ جہاد کے لئے مامور کیا گیا اور جب دمشق کے قریب مغلوں سے جنگ ہوئی تو یہ اس میں شریک تھا۔ اس کے بعد ۷۰۴ھ میں اس نے اس جنگ میں حصہ لیا جو جبل الکسروان کے اسماعیلی و نصیری شیعوں کے خلاف قائم ہوئی تھی ——— ۷۰۵ھ میں جب یہ قاہرہ پہونچا تو اس کے خلاف عقیدہ "تجسیمیہ" کا الزام قائم کر کے مع اپنے دو بھائیوں کے دو سال کے لئے مقید کر دیا گیا۔ ڈیڑھ سال گذرنے کے بعد ۷۰۹ھ میں پھر اس کی ایک تصنیف کے خلاف ہنگامہ برپا ہوا لیکن چونکہ اس کے دلائل کا جواب کسی سے بن نہ پڑا اس لئے اصل الزام میں تو اسکو سزا نہ دی جا سکی لیکن مصالح سیاسی کے بنا پر وہ پھر مقید کر دیا گیا۔

اس کے بعد جب وہ قاہرہ آیا تو سلطان الناصر کا زمانہ تھا۔ یہ ابن تیمیہ کا بڑا طرفدار تھا اس لئے اس نے ابن تیمیہ کو اجازت دیدی تھی کہ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لے سکتا ہے، لیکن اس نے انکار کر دیا اور مدرسہ میں پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔

۷۱۲ھ میں فوج کے ساتھ اسے شام جانے کی اجازت مل گئی اور دمشق پہونچکر اس نے پھر سلسلہ درس شروع کیا۔ ۷۲۰ھ میں یہ پھر ایک فقہی مسئلہ کے اختلاف پر مقید کر دیا گیا لیکن چند ماہ کے بعد رہا ہو گیا۔ رہا ہونے کے بعد اس نے زیارت قبور انبیاء و اولیاء کے متعلق جو فتویٰ دیا اس پر سلطان نے اس کو پھر مقید کر دیا۔ یہاں وہ برابر تصانیف میں مشغول رہا، لیکن جب بعد کو معلوم ہوا کہ اس کی یہ تمام تحریریں عقاید رائجہ کے خلاف ہیں تو وہ اس مشغلہ سے بھی محروم کر دیا گیا اور آخر کار ۷۲۸ھ میں وہ انتقال کر گیا۔

ابن تیمیہ، حنبلی مسلک رکھتا تھا، لیکن وہ مقلد نہ تھا بلکہ خود مجتہدانہ حیثیت سے رائے زنی کیا کرتا تھا۔ کواکب الدریہ میں بعض

ان مسائل سے بحث کی گئی ہے جن میں ابن تیمیہ نہ صرف تقلید بلکہ اجماع کا بھی قائل نہ تھا۔

یہ بدعت کا سخت مخالف تھا اور اسی لئے اس نے زیارت قبور کے خلاف فتوٰی صادر کیا تھا۔ وہ قرآن و حدیث میں تاویل کا قائل نہ تھا اور اسی لئے جو صفات الٰہیہ کلام مجید میں مذکور ہیں ان پر بالکل لغوی معنی کی حیثیت سے ایمان رکھتا تھا، چنانچہ ابن بطوطہ کی روایت ہے کہ "ایک بار ابن تیمیہ نے دمشق کی مسجد جامع میں منبر پر بیٹھکر کہا کہ خدا آسمان سے زمین پر بالکل اسی طرح اترتا ہے، جیسے میں منبر سے اتروں" اور یہ کہکر وہ منبر سے اتر پڑا۔

اس کی فطرت نہایت سخت قسم کی مناظرانہ و مجادلانہ واقع ہوئی تھی۔ اس نے تحریر و تقریر دونوں طرح سے خارجی، مرجی، رافضی، قدری، معتزلی، جہمی، اور اشعری عقاید کی مخالفت کی اور اسی لئے سب اس کے دشمن تھے۔ اس نے طلاق و نکاح کے بعض مسایل فقہیہ سے بھی اختلاف کیا۔ وہ اس کا قائل نہ تھا کہ ایک عورت طلاق مغلظ کے بعد کسی اور سے نکاح کرکے پھر اپنے شوہر اولیٰ کے عقد میں آسکتی ہے، وہ اجماع کے مخالفت کو کفر و فسق سے تعبیر کرنے کا بھی سخت مخالف تھا۔

وہ کہا کرتا تھا کہ خلفاء و صحابہ سے بھی غلطیوں کا امکان ہے اور انھوں نے بارہا غلطیاں کیں، چنانچہ اس نے کہا کہ حضرت عمر نے مسجد الجبل کے منبر پر بہت سی غلطیاں کیں، اسی طرح وہ جناب امیر کا تین سو غلطیاں کرنا ظاہر کرتا تھا۔ وہ غزالی، ابن عربی اور صوفیہ کا مخالف تھا۔ غزالی کی تصنیف "منقذ من الضلال" پر اظہار رائے کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جو فلسفہ اس میں پیش کیا گیا ہے بالکل غلط ہے۔ اسی طرح احیاء العلوم پر اس کو یہ اعتراض تھا کہ غزالی نے اس میں بہت سی موضوع احادیث سے استناد کیا ہے۔ صوفیہ و متکلمین کو بھی وہ برا سمجھتا تھا اور ابن سینا کے فلسفہ کا بھی مخالف تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اسلام میں مختلف فرقوں کا پیدا ہو جانا محض فلسفہ کے بدولت ہوا —— وہ یہود و نصاریٰ کا بھی شدید دشمن تھا۔

اس کے مخالفین میں سے خاص خاص لوگ یہ تھے:۔ ابن بطوطہ۔ ابن حجر الہیتمی۔ تقی الدین السبکی۔ عبدالوہاب۔ ابو حیان —— اور موافقین میں ابن قیم الجوزی۔ الذہبی۔ ابن قدامہ۔ ابن الوردی۔ محمود الآلوسی قابل ذکر لوگ ہیں۔

تذکرۂ معرکۂ سخن شائع ہو گیا

یہ تذکرہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کا بالکل پہلا تذکرہ ہے جس میں زمانۂ قدیم سے لے کر موجودہ عہد تک کے تمام مشہور شعراء فارسی و اردو مثلاً (آتش، آرزو، آزاد بلگرامی، احسن مارہروی، اصغر گونڈوی، ڈاکٹر اقبال، امیر، انیس، یگانہ، جگر، حزیں، خواجہ کرمانی، دبیر، ریاض، سودا، شرر، صائب، صفی، حالی، شیرازی، عزیز لکھنوی، غالب، میر، ناسخ وغیرہ وغیرہ) کے کلام پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں مع جواب و محاکمہ یکجا کر دئے گئے ہیں فن شعر و انشاد کے شائقین کے لئے عجیب چیز ہے۔ قیمت مع محصول عہ

مینجر نگار لکھنؤ

مطبوعات موصولہ

زوالِ غازی

یہ تاریخ ہے امان اللہ خاں فرماں روائے کابل کے زوال اور اس انقلاب کی جس نے چند دنوں کے لئے بچہ سقہ ایسے معمولی انسان کو افغانستان کے تخت و تاج کا مالک بنا دیا تھا۔

یہ کتاب کسی ایسے شخص کی لکھی ہوئی نہیں ہے جو زبانی روایات، یا جراید و رسائل کی اطلاعات سے آگے نہ بڑھ سکتا ہو، بلکہ ایک ایسے واقف افغان شخص کی تصنیف ہے جو کابل دس سال تک افغانستان میں رہ چکا ہے، اور جس نے انقلاب کے تمام خونیں مناظر اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں، الغرض یوں سمجھئے کہ یہ "قصۂ زمین" اس کا بیان کیا ہوا ہے جو "برسرِ زمین" موجود تھا اور خود بھی اس فتنہ سے متاثر ہوا تھا۔

اس کتاب کے مصنف، عزیز ہندی ہیں، جو کابل سے واپس آنے کے بعد یہاں نظر بند کر لئے گئے ہیں اور جنھوں نے ملتان سنٹرل جیل ہی سے اس کتاب کو شایع کیا ہے۔ اس تصنیف کو دس ابواب میں تقسیم کر کے نہ صرف امان اللہ خاں کی سیاحت یوروپ سے لیکر نادر خاں کی تخت نشینی تک کے تمام واقعات کو مسلسل طور پر بیان کیا ہے، بلکہ وہاں کے قبایل کی سیاست، سیاسی جماعتوں کا قیام، امان اللہ خاں کے پیش نظر اصلاحات، ملاؤں کی ذہنیت، بغاوت کے اسباب، بچہ سقہ کی کامیابی کے وجوہ سبھی کچھ اس تصنیف میں پائے جاتے ہیں اور سیاسیات افغانستان سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس میں کافی مواد فراہم کر دیا گیا ہے۔

اس کی ضخامت ۲۵۶ صفحات کی ہے اور طباعت و کتابت دونوں بہت روشن ہیں، غیر مجلد نسخہ کی قیمت تین روپیہ ہے اور فاضل مصنف سے سنٹرل جیل ملتان کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

نرگسِ جمال

ترجمہ ہے میٹرلنک کے ڈرامہ جوائزل کا۔ مارس میٹرلنک (بلجیم کا مشہور ڈرامہ نگار) ہمارے شاہد صاحب کا نہایت محبوب مصنف ہے، اور اس میں شک نہیں کہ ان کا یہ ذوق نہایت مشکل پسند ذوق ہے۔

میٹرلنک کے ڈرامے عموماً چونکہ اسٹیج کے لئے نہیں ہوتے اس لئے ان میں علمی و فلسفیانہ شان زیادہ پائی جاتی ہے اور طبقہ خواص ہی کی "تسکینِ ذوق" انکا اصل مقصود ہوتا ہے۔

میٹرلنک زیادہ تر "عشق و جمال" اور اس کے متعلقات سے گفتگو کرتا ہے، اسی لئے اس کے یہاں جذبات کی نزاکت و وسعت، اور فطرتِ انسانی کی وہ لچک جسے ہم چاہیں تو روحانیت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ وہ دہشت انگیز مناظر پیش کر کے دلوں کو دہلانا پسند نہیں کرتا، وہ انسان کی خون آشامیوں کے فسانے سنا کر روح کے سکون کو مضطرب کرنا نہیں چاہتا بلکہ صرف

ان لطیف و پاکیزہ انعطافات کی داستان سناتا ہے جو حسن سے پیدا ہوتے ہیں، محبت کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں اور روح میں جذب ہو کر شاہراہ انسانیت کو منور بنا جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جس ادیب کا ذوق سخن یہ ہو گا، اس کے یہاں خیال کی نزاکت، بیان کی ندرت، طرز ادا کی جدت اور معنی کے لحاظ سے الفاظ کا اشکال سبھی کچھ ہو گا اور ایک غیر زبان سے ان تمام خصوصیات کو اپنی زبان میں منتقل کرنا یقیناً آسان کام نہیں، لیکن مسٹر شاہد احمد بی۔ اے۔ اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں، اور اس کا سبب یہی ہے کہ وہ خود اسی ذوق کے ادیب ہیں۔

ایسی کتابوں کے ترجمہ میں بڑی دقت یہ ہوتی ہے کہ ایک طرف جذبات کی سادگی یہ چاہتی ہے کہ الفاظ بھی ویسے ہی سلیس و سادہ ہوں اور دوسری طرف احساس کی بلندی جو لازماً بیان میں نزاکت پیدا کر دیتی ہے، اس کی مقتضی ہوتی ہے کہ الفاظ و تراکیب بھی دقیق ہوں اور ایک مترجم گھبرا جاتا ہے کہ وہ ان دونوں کو کیونکر ایک جگہ مجتمع کر سکتا ہے۔ ہر چند شاہد صاحب نے ان دونوں باتوں کے امتیاز میں کافی احتیاط سے کام لیا ہے اور اسی لئے اصل مصنف کے کلام کی روح ترجمہ سے مفقود نہیں ہوئی۔ تاہم اس میں اصلاح و ترقی کی کافی گنجایش باقی ہے۔

مثلاً میں چند الفاظ اور جملے مختلف مقامات سے پیش کرتا ہوں۔ ترجمہ کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے "تو خفتہ ہے میری روح" ــــ لفظ خفتہ اردو میں تنہا بغیر کسی ترکیب کے مستعمل نہیں ہے، اس لئے "تو سو رہی ہے" لکھنا زیادہ مناسب تھا ــــ فقرہ کے اختتام پر "تو سو رہی ہے" انھوں نے لکھا ہے، اس لئے یہ تکرار اور زیادہ پر لطف ہو جاتی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "تیرے موئے پریشاں نیلے کہر کی طرح پھیلے ہوئے ہیں" ــــ اس میں "موئے پریشاں" کے بجائے صرف بال ہونا چاہئے تھا۔ پریشان کی صفت کا اظہار ضروری نہ تھا جبکہ بعد کو "پھیلے ہوئے" سے یہ مفہوم متعین ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک جگہ "شب کی خوشبوؤں" لکھا ہے، حالانکہ بجائے شب کے اگر رات لکھا جاتا تو زیادہ دلکشی پیدا ہو جاتی۔

"گلاب کے ورق انداختہ پھولوں" سے معلوم نہیں ان کی کیا مراد ہے۔ فارسی میں ورق انداختن صرف گنجفہ کی اصطلاح ہے یعنی پتہ ڈالنا، لیکن پھولوں کے لئے کبھی استعمال نہیں ہوتا۔

"چاند میں غیر محسوس طور پر آمیز کر دیتی ہے" ــــ لفظ آمیز یہاں کانوں کو بہت برا معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے "چاند میں آمیز کر دینا" کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جس منظر کو پیش کیا گیا ہے اس کے لحاظ سے میری رائے میں یوں ہونا چاہئے تھا "چاندنی میں غیر محسوس طور پر جذب کر دیتی ہے یا ملا دیتی ہے"

"ہمارا تخئیل یہ نہیں جانتا" ــــ تخئیل بر وزن تفعیل ہے اس لئے اس کو مونث استعمال کرنا چاہئے۔ علاوہ اس کے جس موقعہ پر یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کا اقتضا یہ ہے کہ بجائے تخئیل کے تخیّل لکھا جائے۔ تخیّل کا مفہوم وہی ہے جو انگریزی لفظ Imagination کا، لیکن تخئیل کا مفہوم ہے خیال سے کوئی بات پیدا کرنا ــــ تخیّل کے بجائے تخئیل کا استعمال اور بھی کئی جگہ کیا گیا ہے۔

صفحہ ۴ میں ایک جگہ "خوفناک ادویّہ" نظر آتا ہے، حالانکہ "خوفناک دواؤں" زیادہ موزوں ہوتا۔

صفحہ ۲۳ ــــ "صعب و کرب میں محو تھا" لفظ محو کا استعمال درست نہیں۔ اس کے بجائے اگر یوں لکھا جاتا کہ "درد و اذیت میں مبتلا تھا" تو بہتر ہوتا۔ ایک جگہ یہ جملہ نظر آتا ہے۔ "اپنی بیوفا آواز کو اظہار منشاء مافی الضمیر سے باغی پایا" یہاں لفظ منشاء بالکل بیکار ہے جس نے خواہ مخواہ توالی اضافات پیدا کر دیا۔

بعض جگہ ہندی الفاظ کے ساتھ عربی و فارسی کے الفاظ ایسے استعمال کئے گئے ہیں جو ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً "حیرت انگیز چاہت طویل و نشچل ــــ دائمی گمبھیری ــــ ملائم مصیبتیں ــــ

کہیں کہیں غلط الفاظ بھی نظر آتے ہیں مثلاً "متلاشی" جستجو کرنے والے کے معنی ہیں، حالانکہ فارسی و اردو میں تلاش سے ڈھونڈنے والے کے معنی میں تلاشی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے داغ لکھتا ہے:۔

جلوت میں یوں ہے وہ کہ تلاشی ہے چشم شوق ‏ ‏ خلوت میں اسطرح ہے کہ خلوت گزیں نہیں

نور العین واقف کا شعر ہے:۔ ‏ ‏ دل تلاشی ست ہمی شکر لب را ‏ ‏ شکر اللہ سعیہ ابدا

یہ عربی لفظ نہیں ہے کہ اس کا اسم فاعل متلاشی بنایا جائے۔ اسی طرح انکسار کے جگہ انکساری ایک جگہ نظر آتا ہے جو صحیح نہیں۔ الغرض اس ترجمہ کو ابھی اور سادہ کرنے کی ضرورت ہے امید ہے کہ شاہد صاحب آیندہ اشاعت میں اس کا خیال رکھیں گے مثلاً "آسمان سے بارشِ گل ہوی ہے" اس کے بجائے اگر یہ لکھا جاتا کہ "آسمان سے پھول برسے ہیں" تو کتنا اچھا معلوم ہوتا۔

یہ کتاب مجلد شائع ہوی ہے اور ایک روپیہ میں دفتر رسالہ ساقی دہلی سے ملسکتی ہے۔

پروین و ثریا

یہ بھی ترجمہ ہے مٹرلنک کے ایک ڈرامہ (ایگلے ون اینڈ سیلے سٹ) کا، جو شاہد صاحب اور دہلی کے مشہور ادیب جناب فضل حق قریشی کی مشترکہ قوت فکر کا نتیجہ ہے۔ یہ ترجمہ بہ نسبت "نرگس جمال" کے زیادہ سلیس و شگفتہ ہے۔ اس کا ایک سبب غالباً یہ ہے کہ یہ ڈرامہ جوائزل سے کم دقیق ہے اور دوسرا یہ کہ "نرگس جمال" پہلی کوشش تھی اور یہ دوسری ہے۔

کہیں کہیں اسمیں بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے اور امید ہے کہ آیندہ اشاعت میں اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔ مثلاً:۔

"میں یہ سطور تحریر کر رہی ہوں" ــــ اس کی جگہ یوں بھی ہو سکتا تھا "میں یہ سطریں لکھ رہی ہوں"۔ "تم بالکل ایک بھائی کیطرح مجھ سے ملاقات کروگے ــــ بجائے "ملاقات کروگے" کے "ملوگے" کافی تھا۔ "سابقہ کنجی" ــــ کی جگہ "پہلی کنجی" لکھنا زیادہ اچھا تھا۔ "تکلم خاموش" کے بجائے "خاموش گفتگو" یا "زبانِ بے زبانی" لکھ سکتے تھے۔ "مجھے خائف کئے رکھتا ہے" ــــ یہاں لفظ کئے بالکل بیکار ہے۔ "وہ چاند کی روشنی میں ممتزج ہوتی معلوم ہو رہی ہے" ــــ اس جملہ میں لفظ ممتزج بہت ثقیل ہے، بجائے اس کے تحلیل لکھ سکتے تھے یا جملہ کی ترکیب بدل کر یوں لکھتے کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چاند کی روشنی میں گھلی جا رہی ہے"۔

اسکی قیمت بھی ایک روپیہ ہے اور دفتر رسالہ ساقی دہلی، ملنے کا پتہ

اردو میں ڈرامہ نگاری

سید بادشاہ حسین صاحب حیدر آبادی کی تصنیف ہے۔ اس میں ڈرامہ کی ابتدا اور اسکی مختلف قسموں سے بحث کرنے کے بعد ڈراما اور تھیٹر کے تعلق کو ظاہر کیا گیا ہے اور پھر اردو ڈرامہ نگاری کے ماضی، حال و مستقبل پر گفتگو کی گئی ہے۔ ایک باب "فلم اور اردو ڈراما" کے عنوان سے بھی اس میں نظر آتا ہے، جو "موسم" کی چیز ہے۔

ادبیات میں ڈرامہ ہی وہ چیز ہے جو نفسیاتِ انسانی سے "تادیبی" تعلق رکھتی ہے اور اس لئے اس کی ترقی یقیناً ایک قوم کے صحیح ذوق کی ترقی ہے۔

ڈرامہ یوں تو بظاہر ایک جداگانہ فن لطیف کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن حقیقتاً وہ مجموعہ ہے تمام فنونِ لطیفہ کا، کیونکہ اس میں نثاری بھی ہے اور شاعری بھی، نقاشی بھی ہے اور موسیقی بھی، اسی لئے ہر ادیب اچھا ڈرامہ نگار نہیں ہو سکتا جب تک اس کا ذوق جملہ فنونِ لطیفہ پر حاوی نہ ہو۔ اسی کے ساتھ ڈرامہ نگار کو نفسیاتِ انسانی کا بھی ماہر ہونا چاہیئے، کہ بغیر اس کے ڈرامہ کا تادیبی مقصد کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔

افسوس ہے کہ ہندوستان میں اس وقت تک اس فن نے کوئی قابل ذکر ترقی نہیں کی اور اس کا سبب یہ ہے کہ عرصہ تک ڈرامہ اور اسٹیج کو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ علیحدہ رکھا گیا اور وہ لوگ جو اپنے دماغ کے لحاظ سے اچھے ڈرامہ نگار ہو سکتے تھے، انھوں نے اداکاری کو توہین سمجھا، لیکن اب یہ بُعد و احتراض کم ہوتا جارہا ہے اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کی توجہ روز بروز اس طرف بڑھتی جاتی ہے۔

اس کتاب کے مصنف حیدر آباد کے ایک خوش فکر نوجوان ہیں اور اس سے قبل بھی ایک دو کتابیں ان کی شایع ہو چکی ہیں۔ کتاب مفید ہے اور کافی معلومات اسمیں فراہم کر دی گئی ہیں۔ قیمت دو روپیہ ہے اور آرکیڈیا نیوز ایجنسی حیدر آباد سے مل سکتی ہے۔

بھگوت گیتا یا نغمۂ خداوندی

اردو ترجمہ ہے بھگوت گیتا کا۔ اصل کتاب کی اہمیت ایک جانی بوجھی حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے اس پر اظہار خیال کی ضرورت نہیں، رہ گیا ترجمہ جو اس کی صحت و خوبی کے متعلق کیا گفتگو ہو سکتی ہے جب کہ ڈاکٹر بھگوانداس ایسے فاضل شخص نے جو سنسکرت اور فلسفۂ ہندو مذہب کے مشہور ماہر ہیں، اس کو دیکھکر پسند فرمایا ہو۔

ترجمہ کے ساتھ ساتھ جو ذیلی صراحتیں، فاضل مترجم نے جا بجا کی ہیں وہ بہت مفید ہیں اور کہیں کہیں ہندو فلسفہ کے اصطلاحوں کو قرآن، حدیث اور مسلم صوفیہ کے اقوال سے مطابق کرکے ان کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔

ابتدا میں ایک بسیط مقدمہ بھی ہے جس میں بھگوت گیتا کی تعلیم، اور فلسفۂ ویدانت پر نہایت پر مغز بحث کی گئی ہے۔ سخت ضرورت ہے کہ مسلمان جنکو ہندوؤں ہی کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہے اس کتاب کا مطالعہ کریں، نہ صرف اس لئے کہ وہ خود ان کے مذہب و مسلک کو سمجھ سکیں، بلکہ اس لئے بھی کہ خود ہندوؤں سے بھگوت گیتا کی تعلیم پر چلنے کا مطالبہ کر سکیں، جو یکسر اخوت و ہمدردی کی تعلیم ہے۔

اس کے مترجم محمد اجمل خانصاحب ام۔ اے۔ ہیں اور کتاب کے ملنے کا پتہ ادارۂ نوامیس الٰہیہ (دائرہ) الٰہ آباد، قیمت ایک روپیہ ہے۔

علم الحروف

یہ تالیف ہے جناب حکیم محمود علی خانصاحب ماہر کی جو دہلی کے مشہور طبیب ہیں، اس مجموعہ میں مختلف زبانوں کے حروف ہجا، اور رسم الخط کے متعلق غیر معمولی محنت و کاوش سے کام لے کر ایسا اور اتنا مواد فراہم کر دیا گیا ہے کہ کسی دوسری جگہ دستیاب ہونا دشوار ہے۔ اس کتاب میں زبانوں کی تحقیق، ان کی پیدائش اور درجہ بدرجہ ترقی کا ذکر کر کے تمام دنیا کے رسم الخط سے بحث کی گئی ہے اور خطاطی کی وہ تمام قسمیں جو مسلمانوں میں رائج ہوئیں بیان کی گئی ہیں، اسی کے ساتھ جو بڑے بڑے مشہور خطاط گذرے ہیں ان پر تاریخی روشنی ڈالتے ہوئے اُن کے خط کے نمونے بھی دئے گئے ہیں۔ علاوہ اسلامی زبانوں اور مسلمان خطاطوں کے دوسرے ممالک کی زبانوں اور اُن کے نقوش تحریر کا بھی نہایت محققانہ انداز میں ذکر کیا گیا ہے

معلوم نہیں حکیم صاحب نے اس کتاب کی ترتیب میں کتنے سال صرف کئے ہوں گے اور کہاں کہاں سے یہ معلومات فراہم کی ہوں گی۔ اس کی قیمت تین روپیہ ہے اور فاضل مؤلف سے فراشخانہ دہلی کے پتہ پر ملسکتی ہے۔

قربانی

ایک اصلاحی ڈرامہ ہے جسے پنڈت کشن پرشاد صاحب کول نے تصنیف کیا اور منیجر لیڈر پریس الہ آباد نے شایع کیا ہے۔ پنڈت کشن پرشاد کول، سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے ممبر ہیں اور اردو زبان کا نہایت صحیح ذوق رکھتے ہیں۔ ان کی متعدد تالیفات اس سے قبل شایع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔

اس ڈرامہ کا موضوع ہندو عورت کی معاشری اصلاح ہے۔ اور نکاح کے مسئلہ میں قدامت پرستی کے خلاف احتجاج زبان کے لحاظ سے بھی ڈراما بہت صاف و دلکش ہے۔ ۸ر آنہ قیمت ہے اور لیڈر پریس الہ آباد سے مِل سکتا ہے۔

دِلّی کا آخری دیدار

رسالہ نگار کے ظفر نمبر میں دو مضمون عجیب و غریب شایع ہوئے تھے ایک مرزا فرحت اللہ بیگ کا اور دوسرا سید وزیر حسن صاحب کا۔ مرزا صاحب کا مضمون خواجہ حسن نظامی صاحب نے علیحدہ کتابی صورت میں شایع کیا اور ادارہ ساقی نے سید صاحب کا مضمون۔

اس مضمون کا عنوان "دلی کا آخری دیدار" ہے اور اس میں دہلی کی تہذیب اور آخری عہد تیموری کی رنگین و دلچسپ معاشرت کو حد درجہ موثر اور محاکاتی انداز میں ظاہر کیا گیا ہے۔ سید وزیر حسن صاحب دہلی کے ان مخصوص انشا پردازوں میں سے ہیں جو "بالقوۃ" تو ہمیشہ سے بہترین ادیب تھے، لیکن "بالفعل" ہوئے وہ کسی نہ کسی خاص تحریک سے۔ اور یہ فخر غالباً نگار کیلئے کم نہیں کہ سب سے پہلے اسی نے سید وزیر حسن صاحب کی اس خصوصیت کو ملک کے سامنے پیش کیا۔

• یہ جواہر ریزے ۱۲ر آنہ میں دفتر رسالہ ساقی دہلی سے مل سکتے ہیں۔

آغاز ہستی

ترجمہ ہے برنارڈ شا کے ایک ڈرامہ کا جو نگار (جنوری و فروری ۲۷ء) میں شایع ہوا تھا۔ برنارڈ شا کا ڈرامہ اور جناب مجنوں گورکھپوری کا ترجمہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ——— "حُسن ائس پر لوش کا اور پھر بیاں اپنا"!

شروع میں ایک مختصر سا مقدمہ بھی ہے جس میں برنارڈ شا کی تمثیل نگاری پر رائے زنی کی گئی ہے۔ چھوٹی تقطیع کی ۷۰ صفحات کی کتاب ہے اور قیمت ایک روپیہ جو یقیناً زیادہ ہے۔ ملنے کا پتہ ایوان اشاعت گورکھپور ہے

ہوش کے ناخن

ڈرامہ ہے جسے حیدرآباد کے دو فاضل نوجوانوں (مرزا حسن و محمد رحمی الدین) نے اسٹیج کیلئے لکھا ہے اور جس میں حیدرآباد کی سماجی زندگی پیش کیگئی ہے۔ یوں تو یہ ایک انگریزی ڈرامہ سے ماخوذ ہے لیکن پیش کیا گیا ہے ایسی صورت سے کہ بالکل اپنی چیز معلوم ہوتا ہے۔ یہ دو بار حیدرآباد میں اسٹیج ہو کر لوگوں کی پسندیدگی بھی حاصل کر چکا ہے۔ اس میں حیدرآبادی زبان کے جو نمونے پیش کئے گئے ہیں ان سے شاید ایک مقصود یہ بھی ہوگا کہ وہ غیر ملکی تنقید سے بے نیاز ہو جائیں۔ اسکی قیمت ۸ ر آنہ ہے اور مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد سے مل سکتا ہے۔

معاشقۂ نپولین

ترجمہ ہے ایک فسانہ کا جو پہلے فرانسیسی زبان میں لکھا گیا اور پھر فارسی و عربی میں منتقل ہوا۔ یہ ترجمہ فارسی سے کیا گیا ہے اور مولوی سید تمکین کاظمی اور مولوی محمد عبدالمنعم سعیدی کی مشترکہ محنت کا نتیجہ ہے۔ اس میں نپولین کی حیات عشقیہ کا ایک خاص واقعہ بیان کیا گیا ہے اور بعض خصوصیات کے لحاظ سے پڑھنے کی چیز ہے۔ ترجمہ صاف و سلیس ہے لیکن نظرثانی کا محتاج۔ متعدد تصاویر بھی شامل کردی گئی ہیں جن سے کتاب کی دلکشی اور بڑھ گئی ہے۔ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد سے ایک روپیہ میں اسکو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

(ضمیمہ ۱۱ و ۵ قاعدہ (۲۰) ضابطہ دیوانی)

سمن بغرض انفصال مقدمہ

مقدمہ نمبر ۲۳۵۶ سنہ ۱۹۳۴ء

بعدالت جناب سید خورشید حسن صاحب بہادر جج خفیفہ لکھنؤ

لالہ گھنشیام داس ولد لالہ بالمکند رستوگی ساکن رستوگی ٹولہ تھانہ چوک شہر لکھنؤ و مالک بی ڈی آفاق کمپنی نظیرآباد .... مدعی

بنام

مرزا باقر علی وغیرہ

بنام (نمبر ۱ مرزا باقر علی ولد مرزا لطف علی ساکن بادشاہی منڈی الہ آباد حال وارد ڈیوڑھی آغا میر شہر لکھنؤ
(نمبر ۲ حشمت علی ولد عظمت علی ساکن ڈیوڑھی آغا میر شہر لکھنؤ .... مدعا علیہ

ہرگاہ مدعی نے تمہارے نام ایک نالش بابت ۵/۹۵ روپے کے دائر کی ہے لہذا تم کو حکم ہوتا ہے کہ تم بتاریخ چار ۴ ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۵ء بوقت دس بجے اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حال سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور جو کل امور اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جس کے ساتھ کوئی اور شخص ہو جو جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہو اور جوابدہی دعویٰ مدعی مذکور کی کرو اور ہرگاہ وہی تاریخ جو تمہارے احضار کے لئے مقرر ہے واسطے انفصال قطعی مقدمہ کے تجویز ہوئی ہے پس تم کو لازم ہے کہ اپنے جواب دعویٰ کی تائید میں جن گواہوں کی شہادت پر یا جن دستاویزات پر تم استدلال کرنا چاہتے ہو پیش کرو۔

مطلع رہو کہ اگر بروز مذکور تم حاضر نہ ہوگے تو مقدمہ بغیر حاضری تمہارے مسموع اور فیصل ہوگا۔

آج بتاریخ ۱۴ ماہ فروری سنہ ۱۹۳۵ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

(دستخط جج بخط انگریزی)

رباعیات آسی

ہمارے عزیز دوست مولوی عبدالباری آسی اپنے رنگ تغزل کے لحاظ سے ایک خاص مرتبہ کے شاعر ہیں لیکن اب عمر کے ساتھ ساتھ عقل کی پختگی بڑھتی جاتی ہے، انھوں نے رباعیوں کی طرف بھی توجہ کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ ایک رباعی کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ ان کے یہاں تکمیل کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ زبان کی سادگی و روانی، خیال کی ندرت و پاکیزگی، طرز ادا کی ندرت، ان میں سے کسی بات کی کمی ان کے یہاں نہیں ہے۔ وہ اپنی رباعیات کا مجموعہ کتابی شکل میں شائع کرنے والے ہیں، لیکن قبل اشاعت چونکہ وہ ان کو پبلک سے روشناس کرانا چاہتے ہیں اسلئے انھوں نے چند منتخب رباعیاں نگار کو اشاعت کے لئے مرحمت فرمائی ہیں جس کا میں ممنون ہوں۔ نیاز

گردوں کی بساط بے شکن کیسی ہے
رقاصۂ چرخ نغمہ زن کیسی ہے
خورشید و قمر لیے ہوئے ہیں مشعل
اے بار خدا یہ انجمن کیسی ہے

یہ نرگس پرخمار کیا کہنا ہے
یہ سنبل تار تار کیا کہنا ہے
یہ صحن چمن یہ سبزہ یہ باغ گل
کیا کہنا ہو لے بہار کیا کہنا ہے

جب فصل بہار خندہ زن آتی ہے
یوسف بنکر سوئے وطن آتی ہے
مجبور بہار جنگل سے ہیں
فریاد کو بوئے پیرہن آتی ہے

اکسیر ہے اور خاک کہتے ہیں اسے
غفلت ہے اور انہماک کہتے ہیں اسے
یہ عشق ہے اسکے ہیں نرالے انداز
بیداری خوابناک کہتے ہیں اسے

اک بار ہے وہ اگر اٹھائیں اسکو
دستور عمل اگر بنائیں اس کو
ہے مکتب عشق کا یہ پہلا ہی سبق
جو کچھ کہ پڑھے ہے بھول جائیں اسکو

اک قطرہ سے جیحوں سو ابلتے ہیں یہاں
اک ذرے سے مہر سو نکلتے ہیں یہاں
ہے پردہ بپردہ پرتو عالم شوق
اک شعلہ سے سو چراغ جلتے ہیں یہاں

پہلو میں اک آگ سی بھری رہتی ہے
آنکھوں میں بھی کچھ اک تری رہتی ہے
دل شاخ امید تھا اور اکثر یہ شاخ
کٹنے پہ بھی مدتوں ہری رہتی ہے

قبروں سے وہی کلام کر آتا ہوں
افسانۂ غم تمام کر آتا ہوں
جس در پہ ہوا تھا انکا دیدار نصیب
روزانہ اسے سلام کر آتا ہوں

سرمایۂ عافیت کو کھونا ہی پڑا
اس ناؤ کو بیچ میں ڈبونا ہی پڑا
انجام وفا سے پہلے دی جان عزیز
قصہ جو طویل تھا تو سونا ہی پڑا

چھوٹے ہوئے یار منتظر ہیں میرے
مرغان بہار منتظر ہیں میرے
پابستگی وفا اجازت دیدے
پر دشت میں خار منتظر ہیں میرے

جو جام غم و الم دئے جاتے ہیں
ہم ان کو خوشی خوشی پئے جاتے ہیں
جینے کی امید تو نہیں ہے لیکن
مرنے کی امید پر جئے جاتے ہیں

رہبر ہی ملا نہ کوئی ہمراہ ملا
ثمرہ کوئی نہ حسب دلخواہ ملا
ہم دیر بھی ہو چکے اور کعبے بھی گئے
ہم کو تو نہ بت ملے نہ اللہ ملا

ہم بھی ہیں اسی جہاں کے رہنے والے
ہم بھی ہیں یہی رنج کے سہنے والے
کچھ ہم پہ کھلے ہیں راز ہم کہتے ہیں
کچھ اور کہیں گے آگے کہنے والے

یہ موت بھی ہیچ زندگانی بھی ہیچ
افلاس بھی ہیچ کامرانی بھی ہیچ
سرمایۂ عمر نوجوانی ہے مگر
عبرت کہتی ہے نوجوانی بھی ہیچ

کچھ کر نہ سکے گی تیری سعیِ ناکام
وا ہو نہ سکے گا عقدۂ رازِ انام
در مشہدِ زیست سے کراہیں اکثر
قاتل کی عوض ہوئے ہیں بسمل بدنام

معروف گنہ کیا گیا ہے ہم کو
ظلمت میں جو رکھ لیا گیا ہے ہمکو
تو پھر یہ ضمیر کیوں ملا ہے آخر
یہ آئینہ کیوں دیا گیا ہے ہمکو

بتلا اے خاکِ آرمیدہ ہمکو
بتلا اے سبزۂ دمیدہ ہمکو
دیکھے ہیں بہت خدا رسیدہ لیکن
ملتا نہیں کوئی خود رسیدہ ہمکو

کس بات کا خوف ہو یہ کیسا ڈر ہے
کیا موت نظامِ زیست سے باہر ہے
اتنا ہی تو فرق ہستی و مرگ میں ہے
کل سر پہ تھا چاند آج تربت پر ہے

کب تک یہ غرورِ مال و جاہ و دولت
کب تک یہ سرورِ عیش و ذوقِ راحت
آساں نہیں ہے ابنِ آدم ہونا
آخر تجھے چھوڑنی پڑے گی جنت

دنیا کو تم اک سرائے دو در سمجھو
رہنے کی یہاں کے حد مقرر سمجھو
ہے اِذن یہی کہ اس سے آؤ جاؤ
جو اس میں ہے اس سے اسکو باہر سمجھو

سننا ہے نہ کچھ کسی سے کہنا ہے ہمیں
ہر رنج و جود اب جو سہنا ہے ہمیں
یا خدمتِ خلق یا ہجومِ خلائق
ہر طرح غرض غلام رہنا ہے ہمیں

حیران ہوں میں یہ کون شادی و غم
ہیں دونوں طرح کے جسمیں سب باہم
ہم ایسے وجود کو کہیں کیا آسی
جسکے کہ ادھر ادھر ہے موجود و عدم

دنیا سے ہے رازِ قدس پنہاں تیرا
پاتے نہیں جیسے خیر و عصیاں تیرا
موسیٰ سے ہوا تھا جو ادا کیا تجھ کو
فرعون نے کیا کیا تھا نقصاں تیرا

آساں بھی یہی ہے اور مشکل بھی یہی
دریا بھی یہی ہے اور ساحل بھی یہی
جو کچھ کرنا ہے زندگی میں کرلے
غربت بھی یہی ہے اور منزل بھی یہی

بیشک اچھا ہے اسکی طاعت کرنا
بیشک مقبول ہے عبادت کرنا
لیکن ڈرنا بھی چاہئے اے آسی
اللہ سے چاہئے محبت کرنا

آلام و عذاب دیکھتے ہیں ہر روز
اوہام ثواب دیکھتے ہیں ہر روز
ہستی کو سنا گیا تھا اک خواب طویل
ہم خواب میں خواب دیکھتے ہیں ہر روز

وہ پاک خدا کہ جسکے احساں ہیں تمام
وہ پاک خدا کہ جسکے الطاف ہیں عام
کر کرکے بیاں اسکی تمہاری کا
جی بھر کے کیا ہے واعظ و شیخ بدنام

لے نالوں کی دردمند ہو جائیگی
دنیا کو یہی پسند ہو جائیگی
میں پست سمجھ رہا ہوں جسکو آسی
اک دن یہ صدا بلند ہو جائیگی

تقدیر نے جسقدر جفائیں کی ہیں
فطرت نے اسی قدر وفائیں کی ہیں
شاید وہ گناہ سمجھی جائیں آسی
گھبرا گھبرا کے جو دعائیں کی ہیں

میخانۂ دہر کے جدا ہیں انداز
ہر فرقہ کا اس جگہ جدا ہے اک راز
واعظ جسے جانتا ہے اک لغزشِ پا
ساقی اُسے کہہ رہا ہے مستوں کی نماز

اے نو خیال کوئی دشمن ہے نہ دوست
سب تیرے خیال ہیں کہیں مغز نہ پوست
نیرنگِ نظر ہے سب نقوشِ ظاہر
عالم ہمہ زوست بلکہ عالم ہمہ اوست

ہیں بے خبر آل آفت یہ ہے
صورت ہی کوئی نہیں ہے صورت یہ ہے
منزل جو دراز ہو تو کچھ خوف نہیں
منزل کی خبر نہیں قیامت یہ ہے

اُمید بقائے دو، عشرت بھی نہیں
اور بزمِ جہاں میں لطفِ صحبت بھی نہیں
پھر اُس پہ لطیف تر لطیفہ یہ ہے
ہمسے فطرت کو کچھ عداوت بھی نہیں

رہتا ہے گناہ میں کبھی خوار و نژند
نیکی کے خیال سے کبھی ہے خورسند
کیا فطرت مشترک ملی ہے دلکو
عصیاں بھی پسند اسکو نیکی بھی پسند

اک مرغِ چمن قفس سے آزاد ہوا
گلشن میں گیا اڑا بہت شاد ہوا
لیکن ابھی آشیاں میں پہونچا بھی نہ تھا
اڑتا ہوا پھر اسیرِ صیاد ہوا

روتے ہوئے جو ہلاک ہو جاتے ہیں
کیا سب وہ گنہ سے پاک ہو جاتے ہیں
باران بہار میں ہزاروں قطرے
بچتے تو رزقِ خاک ہو جاتے ہیں

امواجِ غم و الم سے ٹکراتا ہے
گردابِ بلا میں پیچ و خم کھاتا ہے
اک بحرِ رواں ہے عمر جسمیں انساں
تنکا سا بہا ہوا چلا جاتا ہے

آوازِ شکستِ دل ہے یہ ساز نہیں
بجتے ہیں یہ تیرے کان آواز نہیں
دھوکے میں نہ آ فریبِ دنیا کے نہ کھا
ہر واقفِ کار واقفِ راز نہیں